بسم اللہ الرحمن الرحیم

شہزادورڈڈاٹ کام

پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب عام قاری کے مطالعہ کے لیے ہیں۔

دعوتی مقاصد کے لیے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ کرنے کی اجازت ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت کریں۔

کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ، اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

contactshahzadworld@gmail.com

+923174972452

www.shahzadworld.com

فہرست

نمبر شمار	نام سورت	صفحہ نمبر
1	سورۃ النباء	2
2	سورۃ النازعات	12
3	سورۃ عبس	20
4	سورۃ تکویر	26
5	سورۃانفطار	31
6	سورۃ مطففین	33
7	سورۃانشقاق	39
8	سورۃ بروج	44
9	سورۃطارق	49
10	سورۃاعلیٰ	53
11	سورۃغاشیہ	56
12	سورۃفجر	59
13	سورۃ بلد	65
14	سورۃشمس	68
15	سورۃالیل	71
16	سورۃالضحیٰ	73
17	سورۃانشراح	74
18	سورۃتین	76
19	سورۃعلق	78
20	سورۃ قدر	83

سورۃ نمبر 01	سورہ عم	بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	کل آیات 40

﴿عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ﴾

(وہ کس چیز کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں)

عم کی اصل عن ما ہے الف کو حذف کر دیا گیا ہے اس دلیل کی وجہ سے جو پہلے گزر چکی ہے۔

سوال: کسی چیز کے بارے سوال کرنا درحقیقت اس چیز کو طلب کرنے کے لئے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو سمیع البصیر ہے تو پھر یہاں کلمات استفہام کو کیوں ذکر کیا؟

جواب :استفہام کا معنی اس چیز کی عظمت وشان کو بیان کرنا ہے جس کے متعلق وہ سوال کرتے ہیں

سوال :عظیم چیزیں مخفی تو نہیں ہوتی ایک جانب اسے عظیم کہا جار ہا ہے اور دوسری جانب مخفی بھی کہا جا رہا ہے کلام کیسے ممکن ہے؟

جواب: گویا کہ اس کی عظمت کی وجہ سے اس کی جنس مخفی ہوگئی ہے پس اس کے متعلق سوال کیا جانے لگا یتسائلون میں واو جمع کی ضمیر اھل مکہ کی طرف راجح ہے وہ لوگ (اھل مکہ) آپس میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے متعلق سوال کیا کرتے تھے

(یتسائلون عن البعث فیما فیھم) سے اس جانب اشارہ ہے کہ یتسائلون فعل باب تفاعل سے مزید فیہ کے معنی میں بھی مستعمل ہے یا وہ نبی پاک ﷺ سے اور مؤمنین سے از روئے استھزا (سوال) کرتے تھے

یسائلون النبی ﷺ سے اس جانب اشارہ ہے کہ فعل تو غیر ثلاثی ہے لیکن ثلاثی کے معنی میں مستعمل ہے اس کی دلیل کیا ہے کہ غیر ثلاثی کے معنی میں ہے تو بتا رہے ہیں یہ عربوں کا قول ہے یتداعونھم ویترائنھم یہ یدعونھم و یرونھم کے معنی میں ہیں یا ضمیر لوگوں کی طرف راجح ہے۔

﴿عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِیۡمِ﴾

(کیا وہ اس بڑی اور اہم خبر کے بارے میں پوچھ رہے ہیں)

جس کی عظمت وشان بیان کی جارہی تھی اس کا بیان ہے یا یتسائلون فاصلہ ہے (یعنی النباء موصوف العظیم صفت موصوف صفت ملکر عن جار کا مجرور قانون کے مطابق جب ایک حرف جار کسی جملہ میں دومرتبہ مستعمل ہو اور دونوں سے ایک ہی معنی مراد ہو تو وہ ایک ہی فعل کے متعلق نہیں ہوں گے۔ اور عم مضمر فعل کے متعلق ہے جس کے ساتھ تفسیر بیان کی جارہی ہے اور اس پر امام یعقوب حضرمی بصری کی قرأت "عمه" دلالت کرتی ہے۔

سوال: امام یعقوب حضرمی بصری کی قرأت کیسے دلالت کر رہی ہے کہ عن النباء عم فعل مضمر متعلق ہے اور عن النباء العظیم فعل ظاہر کے متعلق ہے؟

جواب: امام یعقوب حضرمی بصری کی قرأت میں 'ہ' مذکورہ ہے جو کہ سکت ہے اور سکست وقف کے لئے آتی ہے اور جار و مجرور اور اس کے متعلق کے درمیان وقف کرنا جائز نہیں جس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ "عمه" پر کلام اختتام پذیر ہوگیا اور یتسائلون عن النباء العظیم الگ کلام ہے۔

﴿الَّذِیۡ ہُمۡ فِیۡہِ مُخۡتَلِفُوۡنَ﴾

(جس میں وہ اختلاف کرتے رہتے ہیں)

(وقوع کی سرے) سے ہی نفی کرتے ہوئے اور اس کے وقوع میں شک کرتے ہوئے یا اقرار وانکار کرتے ہوئے۔

﴿کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ﴾

(یقیناً وہ اسے جان لیں گے) سوال کرنے سے روکنا ہے جھڑکنا ہے اور اس پر وعید کرنا ہے

سوال: یتسائلون کی ضمیر واو جمع لوگوں کی طرف راجح ہوگئی تو میں مسلمان بھی شریک ہوں گے جبکہ مسلمان وقوع قیامت کا اقرار کرتے ہوئے پھر انہیں وعید کیوں سنائی جارہی ہے؟

جواب: یہ وعید مؤمنین کو نہیں ہے بلکہ کفار کو ہی ہے کہ چونکہ ابھی کفار زیادہ ہیں اس لیے کفار کو مسلمان پر غلبہ دے دیا ہے جس کی بناء پر وعید علیھم فرمانا

﴿ثُمَّ کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ﴾

(پھر یقیناً وہ اسے جان لیں گے (کہ قیامت برحق ہے))

کلا سیعلمون کو مکرر ذکر کرنا مبالغہ کرنے کے لئے آتی ہے اور تم اس بات کا شعور دلانے کے لئے ہے کہ وعید ثانی وعید اول سے زیادہ شدید ہے (اس صورت میں ثم تراخی رطبہ کے لئے آتا ہے) اور کہا گیا ہے کہ پہلی وعید نزع کے وقت ہوگی اور دوسری وعید قیامت کے وقت ہوگی یا پہلی وعید دوبارہ اٹھائے جانے کے وقت ہوگی اور دوسری وعید جزاء (حساب) کے لئے ہوگی آخری ان دونوں صورتوں میں ثم اپنے حقیقی معنی تراخی زمانہ کے لئے ہوگا اور ابن عامر شامی نے قل لھم کے مقدر ہونے کی وجہ سے "ت" کے ساتھ ستعلمون پڑھا ہے یعنی کلام یوں کا قل لھم سیعلون ثم کلا سیعلمون ۔

﴿اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا وَّالۡجِبَالَ اَوۡتَادًا﴾

(کیا ہم نے نہیں بنادیا زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں)

ان بعض چیزوں کی یاد دلانا ہے جن کا وہ اللہ تعالیٰ کی صنعتوں کے عجائب میں سے مشاہدہ کرتے ہیں جو اس کی کمال قدرت پر دلالت کرتے ہیں تا کہ وہ اس سے دلیل پکڑیں کہ مرنے کے بعد زندہ ہونا صحیح ہے جس طرح اس کی وضاحت کئی بار گزر چکی ہے ۔ مھدا کو مھدا بھی پڑھا گیا ہے یعنی زمین ان کے لئے ایسے بنادی گئی ہے جیسے بچہ کے لئے پنگوڑا (مھدا) مصدر ہے جسے نام دیا گیا ہے اس چیز کے لئے جسے سونے کے لئے خوشگوار بنایا جاتا ہے (یعنی بچھایا جاتا ہے)

﴿ وَّخَلَقۡنٰكُمۡ اَزۡوَاجًا﴾

(اور ہم نے پیدا کیا تمہیں جوڑا جوڑا) مذکر اور مؤنث

﴿ وَّجَعَلۡنَا نَوۡمَكُمۡ سُبَاتًا﴾

(اور ہم نے بنادیا ہے تمہاری نیند کو باعث آرام)

"سُبَاتًا" کے بارے میں دو احتمال ہیں

پہلا احتمال: سبات کا معنی قطع ہے معنی ہوگا نیند کو احساس اور حرکت کو ختم کرنے والا بنادیا تا کہ قوت حیوانیہ راحت حاصل کریں

دوسرا احتمال: سبات کا معنی موت ہے

سوال: نیند کو سبات بمعنی موت کہنا کیونکر درست ہوگا؟

جواب: کیونکہ نیند دو اموات میں سے ایک موت ہے

اور اسی سے ایک لفظ مسبوت ماخوذ ہے جو میت کے لیے مستعمل ہے اور اس کا اصل معنی قطع بھی ہے

﴿ وَّجَعَلۡنَا الَّيۡلَ لِبَاسًا﴾

(نیز ہم نے بنادیا رات کو پردہ پوش) ایسا پردہ کہ جو شخص اس کی تاریکی میں چھپنے کا ارادہ کرے وہ اس میں چھپ جاتا ہے

﴿وَّجَعَلۡنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴾

(اور ہم نے دن کو روزی کمانے کے لیے بنایا) معاش کا وقت جس وقت تم ادھر ادھر جاتے ہو اس چیز کو حاصل کرنے لئے جس کے ساتھ تم اپنی نیند سے اٹھتے ہو۔ وقت معاش سے اس جانب اشارہ ہے کہ معاشا اسم ظرف ہے اور حیاۃ سے اس جانب اشارہ ہے کہ معاشا مصدر میمی ہے۔

﴿وَبَنَيۡنَا فَوۡقَكُمۡ سَبۡعًا شِدَادًا﴾

(اور ہم نے بنائے تمہارے اوپر سات مضبوط (آسمان))

سات آسمان جو ایسے قوی و مضبوط ہیں جن میں زمانوں کا گزرنا کوئی اثر نہیں کرتا۔

﴿وَّجَعَلۡنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا﴾

(اور ہم نے ہی ایک نہایت روشن چراغ بنایا) چمکتا ہوا خواب گرم یہ وھجت النار سے ماخوذ ہے (یہ اس وقت بولا جاتا ہے) جب آگ خوب روشن

ہو یا اس سے مراد حرارت میں انتہاء کو پہنچنا ہے (یعنی بہت زیادہ گرم ہونا) یہ اس وقت الوھج سے مشتق ہوگا جس کا معنی گرمی ہے اور اس سے مراد سورج ہے۔

﴿وَّاَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ﴾

(اور ہم نے برسایا بادلوں سے) یعنی بادلوں سے، جب وہ قریب ہو جائیں کہ ہوائیں انہیں نچوڑ دیں پھر وہ برس پڑیں۔

معصرات سے مراد بادل ہیں اور یہ اعصرات السحائب سے ماخوذ ہے۔

سوال: آپ نے معصرات کا معنی برسنے والا کیوں کیا حالانکہ یہ باب افعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور باب افعال کا خاصہ تعدیہ ہے (متعدی) ہونا ہے جس کے تحت یہ کومتعدی اور متعدی بدو مفعول اور متعدی بہ دو مفعول کو متعدی بسہ مفعول بنا دیتا ہے اس کے باوجود آپ اس کا معنی لازم کی صورت میں کر رہے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: بسا اوقات باب افعال تو ریہ کے بجائے حیونت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کی بناء پر (اس کا معنی لازم کی صورت میں کیا جا سکتا ہے لہذا یہاں یہ حیونت کے معنی میں استعمال کیا جا سکتا ہے لہذا یہاں یہ حیونت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے عربوں کا قول ہے احصد الزرع ، یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کھیتی کٹائی کے وقت کے قریب ہو جائے اسی سے اعصرات الجاریہ بھی ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب لڑکی حائضہ ہونے کے قریب ہو جائے یا پھر المعصرات کا معنی بادل نہیں بلکہ اس کا معنی ہوائیں ہے یعنی ایسی ہوائیں جو اس وقت کے قریب ہو جائیں جب وہ بادلوں کو نچوڑ دیں یا اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو بگولوں والی ہوں (کیونکہ جب ہواؤں میں بگولے اٹھنے لگیں تو یہ بارش کی علامت ہوتی ہے۔

سوال: بادلوں کی طرف تو بارش کی نسبت کی جا سکتی ہے لیکن ہواؤں کی طرف بارش کی نسبت کرنا کیسے درست ہے؟

جواب: ہوائیں بارش برسانے کا ذریعہ اور مبدا ہیں کیونکہ وہ بادلوں کو پیدا کرتی ہیں اور ان کی کھیری کو حرکت دیتی ہیں (یعنی انکے موسلا دھار برسنے کا سبب بنتی ہیں) اور معصرات کا معنی جو ہوائیں کیا گیا ہے اس معنی کی تائید کرتا ہے کہ معصرات کو "من "کی بجائے بالمعصرات بھی پڑھا گیا ہے۔

﴿مَآءً ثَجَّاجًا﴾

(موسلا دھار پانی)

کثرت کے ساتھ بہنے والا پانی اور کہا جاتا ہے ثجہ متعدی بھی ہوتا ہے اور ثج بنفسہ لازم بھی ہوتا ہے (یہاں لازم استعمال ہوا ہے) اور منعباًبکثرۃ کے ساتھ اس بات کی طرف ہی اشارہ ہے کہ حدیث پاک میں ہے کہ افضل حج عج اور ثج ہے یعنی بلند آواز سے تلبیہ کہنا اور قربانی کا خون بہانا اور اسے ثجاجاً بھی پڑھا گیا ہے اور مثاجع الماء پانی کے گرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

﴿لِّنُخۡرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا﴾

(تاکہ ہم اگائیں اس کے ذریعے اناج اور سبزی) جن سے روزی حاصل کی جاتی ہے اور گھاس اور تنکوں سے جو چارہ حاصل کیا جاتا ہے۔

﴿وَّجَنّٰتٍ اَلۡفَافًا﴾

(نیز گھنے باغات)

بعض بعضوں کے ساتھ لپٹتے ہوئے ہیں الفافا کے بارے میں احتمالات مندرجہ ذیل ہیں۔

1: یہ لف کی جمع ہے جیسے جذع کی جمع اجذاع آتی ہے کسی شاعر نے کہا۔

جنة لف و عيش مغدق	گھنا باغ اور خوشحال زندگی
وندامى كلهم بيض زهر	اور تمام کے تمام دوست روشن

2: لفیف کی جمع ہے جیسے شریف لف کی جمع ہے جو کہ لفاء کی جمع ہے جیسے خضراء کی جمع ہے جو کہ لفاء کی جمع ہے جیسے خضراء کی جمع خضر آتی ہے اور خضر کی جمع اخضاء آتی ہے

3: یہ ملتفة کی جمع ہے (اس صورت میں حرف زائدہ کو حذف کر دیا گیا ہے۔

﴿اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ﴾

(بے شک فیصلہ کا دن ہے) اللہ کے علم میں یا اس کے حکم میں۔

﴿مِّیۡقَاتًا﴾

(ایک متعین وقت) ایسی حد جس کے ساتھ دنیا کو موقت کیا گیا ہے اور دنیا اس حد پر ختم ہو جائے گی (یعنی اس مراد صور کا پھونکا جانا ہے) یا مخلوق کے لئے حد ہے جو اس حد تک پہنچ کر ختم ہو جائے گی۔ یعنی عمل تولید ختم ہو جائے گی۔

﴿یَّوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ﴾

(جس روز صور پھونکا جائے گا) یہ بدل ہے یا یوم فصل کا بیان ہے۔

﴿فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا﴾

(تو تم چلے آؤ گے فوج در فوج)

یعنی گروہ در گروہ قبروں سے محشر کی طرف آؤ گے۔ روایت کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا! کہ میری امت سے دس گروہوں کو اٹھایا جائے گا تو ان میں سے بعض بندروں کی صورت پر ہوں گے اور ان میں سے بعض خنزیر کی صورت میں ہونگے اور ان میں سے بعض اوندھے منہ ہوں گے انکو منہ کے بل گھسیٹ کر لے جایا گا بعض اندھے ہوں گے بعض بہرے اور گونگے ہوں گے اور بعض بہرے اور گونگے ہوں گے اور بعض اپنی زبانوں کو چبا رہے ہوں گے اور وہ ان کے سینوں پر لٹک رہی ہوں گی اور ان کے منہ سے پیپ بہہ رہی ہوگی اور اہل محشر ان سے اذیت محسوس کریں گے اور بعض کے ہاتھ اور پاؤں کٹے ہوئے ہوں گے اور بعض آگ کی سولیوں پر لٹکائے جائیں گے اور بعض سے مردار سے بھی سخت بدبو آ رہی ہوگی اور بعض ایسے ہوں گے پہنے ہوئے ہوں گے جن سے تارکول بہہ رہی ہوگی اور وہ ان کے جسموں سے چمٹے ہوئے ہوں گے پھر ان کی تفسیر بیان کی چغلی کی وجہ سے اور حرام خوری کی وجہ سے اور سود کھانے کی وجہ سے اور فیصلہ کرنے میں ظلم کرنے والے کے ساتھ اور اپنے اعمال سے خوش ہونے والوں کے ساتھ اور ایسے علماء کے ساتھ اور پڑوسیوں کو تکلیف دینے والے کے ساتھ اور لوگوں کو سلطان (حاکم) بادشاہ کی طرف لے جانے والوں کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو شہوات کی پیروی کرنے والے ہیں اور اللہ کے حق کو روکنے والوں کے ساتھ اور بہت زیادہ تکبر کرنے والوں کے ساتھ۔

1	چغل خور	بندروں کی شکل میں
2	حرام خوری کرنے والے	خنزیروں کی شکل میں
3	سود کھانے والے	اوندھے منہ ہوں گے
4	میفلوں میں ظلم کرنے والے	اندھے ہوں گے
5	اپنے اعمال پر خوش ہونے والے	گونگے بہرے ہوں گے
6	قول و عمل میں تضاد والے علماء	زبانوں کو چبا رہے ہوں گے اور زبانیں ان کے سینے پر لٹک رہی ہوں گی
7	پڑوسیوں کو تکلیف دینے والے	ہاتھ پاؤں کٹے ہوں گے
8	لوگوں کو حاکم کی طرف لے جانے والے	آگ کی سولیوں پر لٹکے ہوں گے
9	شہوات کی پیروی کرنے والے اور حق اللہ سے روکنے والے ہوں گے	مردار سے بھی زیادہ سخت بدبو آ رہی ہوگی
10	تکبر کرنے والے	ایسے جبے پہن رکھے ہوں گے جن سے تارکول بہہ رہی ہوگی

﴿ وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ ﴾

(اور کھول دیا جائے گا آسمان) اور آسمان کو پھاڑا جائے گا کوفیوں نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے

امام ابوبکر عاصم بن بہدلہ (کوفی)	امام حمزہ بن حبیب الذیات (کوفی)	امام علی بن حمزہ الکسائی الکوفی

﴿ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴾

(تو وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا) وہ بہت زیادہ شگافوں کی وجہ سے گویا کہ تمام کا تمام دروازے ہے (یعنی ہر جانب دروازے ہی دروازے ہوں گے یا وہ دروازوں والا ہو جائے گا۔

﴿ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ ﴾

(اور حرکت دی جائے گی پہاڑوں کو) یعنی ہوا میں جس طرح کہ چھوٹے چھوٹے ذرات (ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں)

﴿ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴾

(تو وہ سراب بن جائیں گے) سراب کی طرح ہو جائے گا کیونکہ جب انہیں پہاڑوں کی صورت میں دیکھا جائے گا اس حال میں کہ وہ اپنے اجزاء کے الگ الگ ہونے اور انکے بکھر جانے کی وجہ سے اپنی حقیقی صورت پر باقی نہیں رہے گے

مثل السراب سے اس جانب اشارہ ہے کہ یہ تشبیہ بلیغ ہے کیونکہ اس میں نہ تو اداۃ تشبیہ مذکور ہے اور نہ ہی الشبہ مذکور ہے۔

﴿ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴾

(درحقیقت جہنم ایک گھات ہے) تارنے کی جگہ ہے جس میں جھنم کے داروغے کفار کو تاڑتے ہیں یا جنت کے نگہبان مومنین کو بچاتے (تاڑتے) ہیں تاکہ پل صراط پر ان کے چلنے میں حفاظت کریں۔

موضع رمد سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ **مرصاد** اسم ظرف کا صیغہ ہے۔

کالمضارب سے اس جانب اشارہ ہے کہ کیا لغت عرب میں ایسی کوئی مثال ہے کہ اسم ظرف کا صیغہ میم مکسور کے ساتھ آیا ہو؟

تو **کالمضارب** سے جواب دیا جا رہا ہے جس طرح کہ **مضمار** بے شک یہ وہ جگہ ہے جس میں گھوڑوں کو سیدھا جاتا ہے (مضمار میں پہلے گھوڑوں کو خوب کھلایا پلایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ ضرب ہو جاتا ہے میدان ایک لمبی رسی کی مدد سے اسے خوب دورایا جاتا ہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اس کے جسم سے چربی ختم ہو جاتی ہے اور وہ صحت مند و توانائی بن جاتا ہے۔

یا پھر معنی یہ وہ گا کہ داروغے کافروں کو تاڑنے میں سخت ہیں تاکہ کوئی بھی اس سے الگ نہ ہو جائے جس طرح **مطعان** ہیں۔

مجدۃ سے اس جانب اشارہ ہے کہ یہ اسم مبالغہ کا صیغہ ہے **کالمطعان** سے اس جانب اشارہ ہے کہ کیا لغت عرب میں کوئی ایسی مثال ہے کہ مبالغہ کا صیغہ اس وزن پر آیا ہو؟

تو **مطعان** سے امام بیضاوی رحمہ اللہ تعالیٰ جواب دے رہے ہیں اور ان کو فتح کے ساتھ (انَ بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں یہ قیامت کے قائم ہونے کی علت

سوال: جب ان پڑھے گے تو اس وقت ترکیبی حالت کیا ہوگی؟

جواب: اس وقت یہ جملہ مستانفہ بن جائے گا یعنی **ان یوم الفصل کان میقاتا** کہ فیصلہ کا دن کیوں مقرر ہے؟

تو جواب یہ ہے کہ جھنم تاڑنے کے لئے تیار ہے۔

﴿ لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ﴾

((یہ) سرکشوں کا ٹھکانا ہے) جائے پناہ اور ٹھکانہ

مرجعاً، **ماٰبا** کا لفظی ترجمہ ہے اور **ماوی** مرادی ترجمہ ہے۔

﴿لّٰبِثِیْنَ فِیْهَاۤ﴾

(پڑے رہیں گے اس میں) امام حمزہ بن حبیب الذیات الکوفی اور روح نے لبثین پڑھا ہے اور یہ زیادہ بلیغ ہے۔

سوال: لبثین ،لابثین سے زیادہ بلیغ کیسے ہے؟

جواب: لا بثین اسم فاعل کا صیغہ ہے اور لبثین صفت مشبہ کا صیغہ ہے چونکہ صفت مشبہ میں دوائم وثبوت پایا جاتا ہے اس لئے لبثین زیادہ بلیغ ہے۔

﴿اَحْقَابًا﴾

(عرصہ دراز) پے در پے زمانے۔

سوال ابن تیمیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ جھنم میں کفار ہمیشہ نہیں رہے گے کیونکہ اگر حقب محدود زمانہ ہو تو کفار کا جھنم میں ہمیشہ رہنا کس طرح صحیح ہوگا؟

جواب احقاب سے مراد پے در پے زمانے ہے اور اس میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ جو جھنم سے کفار کے خروج پر دلالت کرنے والی ہو کیونکہ اگر صحیح ہو کہ حقب سے مراد 80 سال یا پھر 70 ہزار سال ہیں تو اس میں ہونے والے ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جو ان احقاب کے ختم ہونے کا تقاضہ کرے جب بھی ایک حقب گزرے گا تو دوسرا حقب اس کے پیچھے آجائے گا۔

اور اگر اسی طرح مان لیا جائے تو یہ مفہوم مخالف کی قبیل سے ہے پس مفہوم مخالف ایسی نص (آیت) سے خروج پر دال ہو۔

قرآن کریم میں 34 مقامات پر یہ تصریح کی گئی ہے کہ کفار ہمیشہ جھنم میں رہیں گے اور بعض مقامات پر صرف خالدین پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ابداً کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے اس لئے قرآن کریم کی کسی آیت کا ایسا مفہوم بیان کرنا جو دوسری کثیر آیات کے خلاف ہو، کسی مومن کو زیب نہیں دیتا۔

امام نحو قطرب نے کہا ہے کہ حقب اس لمبے زمانے کو کہتے ہیں کہ جس کی کوئی حد نہ ہو اور اگر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان

﴿ لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا اِلَّا حَمِیْمًا وَّ غَسَّاقًا﴾

(وہ نہیں چکھیں گے اس میں کوئی ٹھنڈی چیز اور نہ پانی بجز کھولتے پانی اور گرم پیپ کے) کو لابثین میں ضمیر مستتر سے حال بنایا جا رہا ہے یا احقابا کو لا یذوقون کے ساتھ نصب دی جائے تو اس بات کا احتمال ہوگا کہ کفار جھنم میں رہیں گے کہ اس حال میں کہ وہ سوائے کھولتے ہوئے پانی اور جھنمیوں کی پیپ کے سوا کسی چیز کو نہیں چکھے گئے پھر انہیں عذاب کی دوسری جنس سے بدل دیا جائے گا اور یہ بھی جائز ہے کہ (حقاباً حقب کی جمع ہو جو حقب الرجل سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے کہ جب رزق اس سے کم ہو جائے۔

اور یہ حقب العام سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے کہ جب بارش کم ہو اور بھلائی کم ہو جائے۔

(یعنی جس سال بارش کم ہو اور پیداوار کم ہو) احقابا حال ہو تو معنی ہوگا کہ کفار جھنم میں کئی حقب رہیں گے (اگر حال بنایا جائے تو ابن تیمیہ کا استدلال "کہ وہ جھنم میں ہمیشہ رہیں گے"، ختم ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے لا یذوقون اس کی تفسیر ہے برد سے مراد وہ چیز ہے جو ان کو راحت پہنچاتی ہے اور آگ کی تپش سے ان کو دور کرتی ہے یا برد سے مراد نیند ہے اور غساق سے مراد وہ چیز ہے جو بہتی ہے یعنی پیپ اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد شدید ٹھنڈ ہے اور غسا قا بردا سے مستثنیٰ ہے۔

سوال: اگر غسا قا، بردا سے مستثنیٰ ہے تو ترکیب کلام یوں ہونا چاہیے تھا "بردا و لا شرابا الا حمیما و غساقا " کیونکہ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کے بعد آتا ہے جبکہ یہاں مستثنیٰ منہ بعد مذکور ہوا ہے اس میں کیا حکمت عملی پوشیدہ ہے؟

جواب: اس کو مؤخر کیا گیا ہے تاکہ آیتوں کے آخر میں موافقت وہ جائے (فواصل کی) رعایت کرتے ہوئے حمزہ بن حبیب الذیات الکوفی علی بن حمزہ الکسائی پڑھا ہے (جیسا کہ متن میں ہے)

﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾

((ان کے گناہوں کی) پوری سزا) یعنی ان کو اس کے ساتھ ایسی جزاء دی جائے گی کہ ان کے اعمال کے موافق ہوگی۔

"ذا وفاق "اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ وفا قامصدر ہونے کی بناء پر صفت واقع نہیں ہوسکتا اس لئے اس کے موصوف کے مذکر ہونے کی وجہ سے وفا قامصدر سے پہلے ''ذا'' کا لفظ محذوف نکالیں گے۔

وافقھا وفاقا سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وفا قا فعل محذوف کا مفعول مطلق واقع ہوگا اور جملہ فعلیہ ہوکر صفت بنے گا۔

نوٹ	سب صورتوں میں ترجمہ یکساں ہوگا

اور وفاقا کو وفاقا بھی پڑھا گیا ہے فعال کے وزن پر ہے اور وفقه کذا سے ماخوذ ہے۔

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا﴾

(یہ لوگ (روز) حساب کی توقع نہیں رکھتے تھے) یہ بیان ہے اس چیز کا اس جزاء کے موافق ہوگی۔

﴿وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا﴾

(اورانہوں نے ہماری آیتوں کو سختی سے جھٹلایا) تکذیبا سے اس جانب اشارہ ہے کہ کذابا باب تفعیل کا مصدر ہے اور باب تفعیل کے مصدر چار اوزان پر آتے ہیں اوراس کو تخفیف کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے (یعنی کذابا بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں کذبا کے معنی میں ہوگا (یعنی کذابا کذب کے معنی میں ہے) جس طرح کہ کسی شاعر کا شعر ہے۔

میں نے اس کی تصدیق کی پھر میں نے اس کو جھٹلادیا

پس آدمی کواس کے جھوٹے ہونے نے نفع پہنچایا

اور کذابا کو تکذیب کے قائم مقام رکھا گیا ہے اس بات پر دلالت کرنے کے لئے وہ جھٹلانے میں جھوٹے تھے۔یا کذابا کو مکاذبۃ کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

سوال: باب مفاعلہ میں مشارکت کا معنی پایا جاتا ہے جبکہ جھٹلایا تو صرف کفار نے تھا مسلمان تو قرآن کی تکذیب نہیں کرتے تھے بلکہ تصدیق کیا کرتے تھے تو پھر یہاں باہم جھٹلانے سے کیا مراد ہے؟

جواب: امام صاحب فانهم كانوا عند المسلمين کی عبارت سے جواب دے رہے ہیں کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک کفار جھوٹے تھے اور کفار کے نزدیک مسلمان جھوٹے تھے پس ان کے درمیان یہ مکاذبہ تھا یا معنی یہ ہوگا کہ کفار جھوٹ میں مبالغہ کرتے تھے جیسا کہ جھوٹ میں غلبہ پانے والے مبالغہ کرتے ہیں اور دونوں معنی کے اعتبار سے جائز ہے کہ یہ کاذبین یا مکاذبین کے معنی میں حال واقع ہوگا اور کذابا پڑھا جانا اس کی تائید کرتا ہے۔

یعنی کذابا پڑھا جانا حال ہونے کی تائید کرتا ہے اور کذابا، کاذب کی جمع ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبالغہ کے لئے ہو اس صورت میں یہ مصدر کی صفت کی ہوگا معنی یہ ہوگا کہ ایسی تکذیب جس میں بہت زیادہ جھوٹ ہو۔

﴿وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ﴾

(حالانکہ ہر چیز کو ہم نے گن گن کر رکھ لیا تھا) اوراسے مبتدا ہونے کی بناء پر رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

﴿كِتٰبًا﴾ ( ) یہ احصناہ کا مفعول مطلق ہے۔

سوال: مفعول مطلق ماقبل فعل کا مصدر ہوتا ہے جبکہ کتابا احصیناہ کا مصدر تو نہیں ہے پھر اس کو مفعول مطلق بنانے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: کیونکہ الاحصاء (شمار کرنا) اور الکتبہ (لکھنا) دونوں ضبط کے معنی میں مشترک ہے۔یا یہ فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے یا یہ حال ہے اور مکتوبا فی اللوح کے معنی میں ہے اور جملہ معترضہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

﴿فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا﴾

(پس (اے منکرو! اپنے کیے کا) مزا چکھو اب ہم زیادہ نہیں کریں گے تم پر مگر عذاب) یہ کلام ان کا حساب سے انکار کرنے اور آیات کی تکذیب سے مسبب ہے۔

مسبب: یعنی کفار کو عذاب دینے کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے روز جزاء کا انکار کیا اور آیتوں کی تکذیب کی۔

اور اس کو التفات کے طریقہ پر لانا مبالغہ کے لئے ہے۔

سوال: التفات کیا ہے؟

جواب: التفات یہ ہے کہ کلام میں پہلے ماضی کے صیغے مذکور ہیں جبکہ یہاں مخاطب کا صیغہ آیا ہے

اور حدیث پاک میں ہے کہ قرآن پاک میں دوزخیوں پر سب سے زیادہ شدید آیت یہی ہے

﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا﴾

(بلاشبہ پرہیزگاروں کے لیے کامیابی (ہی کامیابی) ہے) فوزاً سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مفازاً مصدر میمی ہے جبکہ موضع فوز سے اس جانب اشارہ ہے کہ (مفازا) ظرف مکان ہے۔

﴿حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا﴾

((ان کے لیے) باغات اور انگوروں (کی بیلیں) ہیں) ایسے باغ جن میں مختلف الانواع پھل دار درخت ہوں گے اور یہ مفازا سے بدل بعض یا بدل اشتمال ہے۔

بدل بعض: یعنی اھل جنت کو جو جزاء دی جائے گی وہ صرف مختلف الانواع درخت اور میوہ جات ہی نہیں ہوگی بلکہ اس جزاء کا بعض حصہ ان اشیاء پر مشتمل ہوگا۔ اگر مفازاً مصدر میمی ہوگا تو بدل اشتمال ہوگا اور اگر مفازاً ظرف ہوگا تو بدل بعض ہوگا۔

﴿وَّكَوَاعِبَ﴾

(اور جواں سال) ایسی عورتیں جن کی چھاتیاں (سینے) ابھرے ہوئے ہوں گے۔

﴿اَتْرَابًا﴾

(ہم عمر لڑکیاں) ہم عمر

﴿وَّكَاْسًا دِهَاقًا﴾

(اور چھلکتا ہوا جام) بھرے ہوئے (جام) اور یہ ارھق الحوض سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ اس کو بھر لے، علامہ شہاب لکھتے ہیں کہ ارھق کی جگہ رھق بھی درست ہے۔

﴿لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا﴾

(نہ سنیں گے وہاں کوئی بیہودہ بات اور نہ جھوٹ) امام علی بن حمزہ الکسائی الکوفی نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی کذ با (جھوٹ) یا مکاذبہ (باہم جھٹلانا) کیونکہ جنتی لوگ ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولیں گے (یکذب بعضھم بعضا)

﴿جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ﴾ (یہ بدلہ ہے آپ کے رب کی طرف سے) اس کے وعدے کے تقاضے کے مطابق۔

﴿عَطَآءً﴾

(انعام) اس کی طرف سے فضل واحسان ہے (اذ لایجب کی عبارت سے معتزلہ کا رد کیا جا رہا ہے معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ اطاعت شعار لوگوں کو جزاء دینا اللہ پر لازم ہے اور اسی طرح گناہ گاروں کو سزا دینا واجب ہے جبکہ اھل سنہ والجماعہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہمیں جو بھی نعمتیں اللہ تعالیٰ عطا کر رہا ہے کہ اس کا ہم پر احسان ہے اور جنت میں داخل فرمائے گا وہ بھی اپنی رحمت کے صدقے سے ہی داخل فرمائے گا ورنہ ہمارے اعمال اس قابل کہاں؟

اللہ ھم اغفرلنا و ادخلنا فی الجنہ (آمین)

عطاء جزاء سے بدل ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ منصوب ہے جس طرح کہ مفعول بہ منصوب ہے۔

﴿حِسَابًا﴾

(کافی) یعنی کافی یہ احسبہ الشی سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ اس کو کافی ہو جائے یہاں تک کہ وہ کہے کہ مجھے کافی ہے۔ یا جزاء اعمال کے حساب سے ہوگی اور اس کو حسابا بھی پڑھا گیا ہے اور یہ محسابا کے معنی میں ہے جیسا کہ دراک بمعنی مدرک ہے

﴿رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا﴾

(جو پروردگار ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے) یہ جر کے ساتھ من ربک سے بدل ہے اور مجاز کے دو قاری (امام نافع مدنی اور ابن کثیر مکی) اور امام ابو عمر العلاء البصری نے مبتدا ہونے کی بناء پر اسکو رفع دیا ہے

﴿الرَّحْمٰنِ﴾

(بے حد مہربان) امام ابن عامر اشافی، امام ابو بکر عاصم بن بہید لہ الکوفی اور امام یعقوب جعفری بصری کی قرآت میں جر کے ساتھ ربک کی صفت ہے اور امام ابو عمر بن العلاء البصری کی قرآت میں رفع کے ساتھ اور امام حمزہ بن حبیب الذیات الکوفی، امام علی بن حمزہ الکسائی الکوفی کی قرآت میں دوسرا مرفوع ہے اس صورت میں یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگی یا یہ مبتدا ہوگا اور اس کی خبر (لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ہوگی)

﴿لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا﴾

(انہیں طاقت نہیں ہوگی کہ (بغیر اجازت) اس سے بھی بات کر سکیں) اور واو جمع کی ضمیر اھل آسمان کی طرف راجع یعنی وہ ثواب میں اور سزا میں اس پر بولنے اور اعتراض کرنے کے مالک (حق) دار نہیں ہوں گے کیونکہ علی الاطلاق وہ اس کے مملوک ہیں پس وہ اس پر اعتراض کے حق دار نہیں ہوں گے اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ شفاعت کے منافی نہیں ہے (کیونکہ شفاعت باذن قرآن سے بھی ثابت ہے " من الذی یشفع عندہ الا باذن ربہ "

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾

(جس روز روح اور فرشتے پرے باندھ کر کھڑے ہوں گے، کوئی نہ بول سکے گا بجز اس کے جس کو رحمٰن اِذن دے اور وہ ٹھیک بات کرے)

یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی لا یملکون کی وضاحت و تاکید ہے کیونکہ ملائکہ افضل الخلوق ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہیں جب وہ بھی صحیح بات کہنے کی قدرت نہیں رکھتے جیسے مرتضیٰ کے لئے شفاعت کرنا مگر اس کی اجازت کے ساتھ تو پس فرشتوں کے علاوہ دوسری مخلوق گفتگو کرنے کی کیسے مالک ہوگی؟

وضاحت ملاحظہ فرمائیں

علامہ بیضاوی نے یہ عبارت زمخشری سے نقل کی ہے اور علامہ زمخشری چونکہ معتزلی ہیں اس لئے وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سب مخلوقات سے افضل فرشتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب میں ہے اس کے بعد انبیاء اور اس کے بعد عام انسان ہیں لیکن اھل سنہ والجماعہ کا عقیدہ ہے کہ سب سے افضل سرکار دو عالم حضرت محمد ﷺ ہیں پھر انبیاء ان کے چار فرشتے (حضرت جبرائیل علیہ السلام، اسرافیل، عزرائیل،) پھر اولیاء عظام اور پھر عام انسان اور اس کے بعد عام فرشتے ہیں علامہ محمد اقبال نے اس کو یوں بیان فرمایا ہے

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت کچھ زیادہ

اور یوم لا یملکون کے لئے ظرف ہے یا یتکلمون کے لئے ظرف ہے اور روح ایسا فرشتہ ہے جو ارواح پر مؤکل ہے یا اس سے مراد فرشتوں کی ایک جنس ہے یا حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں یا ایسی مخلوق ہے جو فرشتوں سے بھی عظیم ہے (جو کہ ابھی تک دریافت نہیں ہو سکی)

﴿ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ﴾

(یہ دن برحق ہے) ہر صورت میں واقع ہونے والا ہے۔

﴿فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ﴾

(سوجس کا جی چاہے بنالے اپنے رب کے جوارِ رحمت میں)یعنی اس کے ثواب کی طرف (کیونکہ اللہ تعالیٰ جگہ مکان وغیرہ سے پاک ہے اس مضاف محذوف نکالا ہے۔

﴿ مَاٰبًا﴾ (اپنا ٹھکانا) ایمان واطاعت کے ساتھ۔

﴿اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا﴾

(بے شک ہم نے ڈرادیا ہے تمہیں جلد آنے والے عذاب سے)یعنی آخرت کا عذاب۔

سوال: یہ عذاب قریب کیسے ہے؟

جواب: اوراس کا قریب ہونا اس کے متحقق ہونے کی وجہ سے ہے کیونکہ ہروہ چیز جوآنیوالی ہے وہ قریب ہے یا اس کا قریب ہونا اس بناء پر ہے کہ اس کا مبداء موت ہے۔

﴿يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ﴾

(اس دن دیکھ لے گا ہر شخص (ان عملوں کو) جواس نے آگے بھیجے تھے)اور وہ دیکھ لے گا کہ جواس نے بھلائی اور شر میں سے آگے بھیجا ہے اور المرء عام ہے اور کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ''انا اخذرنا کم'' کی وجہ سے اس کا ارشاد گرامی ہے کا فرظاہر ہے

سوال: اگراس سے مراد کافر ہے تو پھراس کی جگہ ضمیر کیوں ذکر نہیں کی گی؟

جواب: اس کو ضمیر کی جگہ رکھنا مذمت کے ذیادتی کے لئے ہے امام بیضاوی''ما'' کی ترکیبی حالت بیان کرر ہے ہیں کہ ماموصولہ ہے اور ینظر کی وجہ سے منصوب ہے یاما استفہامیہ اور''قدمت'' کی وجہ سے منصوب ہے یعنی وہ دیکھے گ کہ کونسی چیز اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجی ہے۔

﴿وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا﴾

(اور کافر (بصد حسرت) کہے گا کاش !میں خاک ہوتا) دنیا میں ہی مجھے پیدا نہ کیا گیا ہوتا اور میں زندہ ہی نہ کیا جاتا اور کہا گیا ہے کہ ہوتا یا اس دن میں دوبارہ زندہ ہی نہ کیا جاتا اور کہا گیا ہے کہ تمام حیوانات کو قصاص کے لئے اٹھایا جائے گا پھر انہیں مٹی کی حالت میں لوٹا دیا جائے گا کافر (انکو کرم ان کی حالت کی خواہش کرے گا)

سورۃ نمبر 02	سورہ النازعات	بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	کل آیات 46

﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًاوَّ النّٰشِطٰتِ نَشْطًاوَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًافَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾

(قسم ہے(فرشتوں کی) جوغوطہ لگا کر(جان) کھینچنے والے ہیں ا،ور بند آسانی سے کھولنے والے ہیں،اور تیزی سے پیرنے والے ہیں اور پھر(تعمیل ارشاد میں) جودوڑ کر سبقت لے جانے والے ہیں،پھر(حسب حکم) ہر کام کا انتظام کرنے والے ہیں)

ان صفات کے بارے میں مندرجہ ذیل احتمالات ہیں

(پہلا احتمال)

یہ موت کے فرشتوں کی صفات ہیں وہ کفار کی روحوں کوان کے بدنوں سے سختی کے ساتھ کھینچتے ہیں

سوال: آپ نے غرقا کوالنازعات کامفعول مطلق بنایا ہے حالانکہ مفعول مطلق ماقبل فعل یاشبہ فعل کا مصدر ہوتا ہے تو یہاں اسے مفعول مطلق بنانا جائز ہے؟

جواب: غرقا ای اغراقا ....اس عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ غرقا اس صورت میں مفعول مطلق ہونے کی بناء پرمنصوب ہے۔غرق،اغراق کے معنی میں ہے پس فرشتے جسم کے دوردراز حصوں سے روح کوسختی کے ساتھ کھینچتے ہیں

(نفوساغرقۃ فی الاجساد......... سے اس جانب اشارہ ہے کہ غرقا مفعول مطلق نہیں بلکہ اسے اس لیے نصب دی گئی ہے کہ یہ محذوف مفعول بہ کی صفت بن رہا ہے اس صورت میں معنی ہوگا) فرشتے ان روحوں کوسختی سے نکال لیتے ہیں جواجسام میں غرق ہوتی ہے

وینشطون ای یخرجون ارواح المؤمنین.........

فرشتے مؤمنین کی روحوں کوبڑی نرمی سے نکالتے ہیں اور یہ عربوں کے قول "نشط الدلومن البئر" سے ماخوذ ہےاور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص ڈول کوکنویں سے باہر نکالے

(السابحات)یسبحون فی اخراجھا ....

وہ روحوں کونکالنے میں اس غوطہ خور کی طرح جسموں میں تیرتے ہیں جوکہ سمندر کی گہرائیوں سے کوئی چیز نکالتا ہے وہ کفار کی روحوں کوآگ کی طرف اور مؤمنین کی روحوں کو جنت کی طرف لے جانے میں سبقت لے جاتے ہیں پس وہ ان کے عقاب وثواب کے معاملات کی تدبیر کرتے ہیں اس طرح کے ان کے لئے جوتکالیف ولذات تیار کی گئی ہیں اس کے ادراک کے لئے تیار کرتے ہیں۔پہلی دوصفات موت کے فرشتوں کی ہیں(النازعات اور الناشطٰت)اور باقی صفات ملائکہ کے دوسرے گروہ کی ہیں

اس صورت میں السابحات کامفہوم یہ ہوگا جن امور کاانہیں حکم دیا گیا ہےان کو بجالانے میں سبقت لے جاتے ہیں پس وہ اللہ کے معاملات کی تدبیر کرتے ہیں (اللہ کا حکم بجالاتے ہیں)

(دوسرا احتمال)

یہ ستاروں کی صفات ہیں۔ستارے نزع میں غرق ہوکر مشرق سے مغرب کی جانب بڑی تیزی سے سفر کرتے ہیں۔اس طرح کہ مدار کا فاصلہ طے کرتے ہیں یہاں تک کہ مغرب کی انتہاء میں نازل ہوجاتے ہیں(غروب ہوجاتے ہیں)اورایک برج سے دوسرے برج کی جانب سفر کرتے ہیں اور یہ نشط الثور سے ماخوذ ہے یہ(اس وقت بولا جاتا ہے) جب بیل ایک شہر سے دوسرے شہر کی جانب چلے(نکلے)اور ستارے مدار میں تیرتے(چلتے ہیں)اور چلنے میں حرکت کی تیزی کی وجہ سے بعض بعض سے سبقت لے جاتے ہیں۔اوروہ ان امور کی تدبیر کرتے ہیں جوان ستارے کے متعلق ہیں مثلاً موسموں کامختلف ہونااور زمانوں کا اندازہ مقرر کرنااور عبادات کے اوقات کا ظاہر ہونا۔جب ستاروں کی حرکات مشرق سے مغرب کی جانب خلاف قیاس ہوں تو اسے نزعا(اور جب)ان کی حرکات ایک برج سے دوسرے برج کی جانب موافق قیاس ہوتو اسے نشط کا نام دیا جاتا ہے۔

(تیسرا احتمال)(الف)

یہ نفوس فاضلہ (فضیلت والے نفوس) کی اس حالت میں صفات ہیں جب وہ اپنے جسموں سے جدا ہوتے ہیں (اس صورت میں معنی ہوگا ان نفوس کی قسم) جو سختی کے ساتھ اپنے بدنوں سے نکلتے ہیں اور اس صورت میں ''اغراق النازع فی القوس'' سے ماخوذ ہے

وہ نفوس بدن سے جدا ہونے کے بعد عالم ملکوت کی جانب سفر کرتے ہیں پھر وہ بارگاہ قدس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں پھر وہ اپنی شرافت اور مقام ومرتبہ کی وجہ سے مدبرات کے مقام پر فائز ہوجاتے ہیں

(تیسرا احتمال)(ب)

یہ نفوس فاضلہ (فضیلت والے نفوس) کی اس حالت میں صفات ہیں جب وہ دنیا میں حالت سلوک کی منزلیں طے کرتے ہیں (معنی یہ ہوگا) وہ شہوات سے رک جاتے ہیں پھر وہ عالم قدس کی طرف چلتے ہیں اور ترقی کے مراتب طے کرتے ہیں پھر کمالات میں سبقت لے جاتے ہیں حتی کہ وہ کاملین میں سے ہوجاتے ہیں

(چوتھا احتمال)

یہ غازیوں کے نفوس یا ان کے ہاتھوں کی صفات ہیں (اس صورت میں معنی ہوگا) وہ بڑی سختی کے ساتھ تیر کو کھینچتے ہیں پھر مارنے کے لیے تیر چھوڑتے ہیں اور وہ خشکی اور سمندر میں تیرتے اور دوڑتے ہیں اور دشمن کی طرف ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں پھر وہ جنگ کے معاملہ کی تدبیر کرتے ہیں

(پانچواں احتمال)

یہ غازیوں کے گھوڑوں کی صفات ہیں

(اس صورت میں معنی ہوگا) وہ لگامیں اتنی سختی سے کھینچتے ہیں کہ وہ لگامیں ان کی گردنوں میں غرق نظر آتی ہیں کیونکہ ان کی گردنیں لمبی ہوتی ہیں اور وہ دار السلام سے دار کفر کی طرف نکلتے ہیں اور دوڑنے میں تیزی کرتے ہیں پس وہ دشمن کی طرف سبقت لے جاتے ہیں پھر وہ کامیابی کی تدبیر کرتے ہیں۔

ان صفات کے ساتھ اللہ تعالی نے قیامت کے قائم ہونے کی قسم اٹھائی ہے اور جواب قسم کو حذف کردیا ہے کیونکہ مابعد آیت اس پر دلالت کررہی ہے

﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴾

(جس روز تھرتھرائے گی تھرتھرانے والی) (یوم اپنے مابعد مضاف الیہ کے ساتھ ملکر جواب قسم محذوف کا ظرف ہے) اور اس کو اس جواب قسم کے ساتھ نصب دی گئی ہے

راجفہ سے مراد ایسے اجسام فلکی ہیں جو ساکن ہیں اور قیامت کے دن ان کی حرکت انتہائی سخت ہوجائے گی جیسے زمین اور پہاڑ اور جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے ''جس دن زمین و پہاڑ تھرتھرائیں گے''

یا راجفہ سے مراد واقعہ ہونے والی وہ گھڑی ہے جس کے وقت اجرام فلکی تھرتھرائیں گے اور یہ پہلا نفخہ ہے

(یعنی واقعہ سے مراد نفخہ اولی ہے)

﴿تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ﴾

(اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا ہوگا) اور رادفہ سے مراد پیچھے آنے والا ہے اور اس سے مراد آسمان وستارے ہیں جو پھٹ جائیں گے اور بکھر جائیں گے

یا رادفہ سے مراد نفخہ ثانیہ ہے اور یہ جملہ حال کے محل میں واقع ہورہا ہے

(جو شخص گھڑسوار کے پیچھے سوار ہو اسے ردیف کہتے ہیں اور اسی سے رادفہ ماخوذ ہے)

﴿قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ﴾

(کتنے دل اس روز (خوف سے) کانپ رہے ہوں گے) گھبراہٹ کی وجہ سے انتہائی مظرب ہونگے اور یہ (واجفہ) قلوب کی صفت ہے (موصوف صفت ملکر مبتدا ہے) اور ابصارھا اس کی خبر ہے

﴿اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ﴾ (ان کی آنکھیں (ڈر سے) جھکی ہوں گی)

سوال: "اَبْصَارُهَا" میں ھا ضمیر کا مرجع دل ہے اور دل کی تو آنکھیں ہی نہیں ہوتی تو آنکھوں کی نسبت دلوں کی طرف کرنا درست نہیں ہے؟

جواب: ھا ضمیر سے پہلے اصحاب کا لفظ محذوف ہے یعنی ان دلوں کے اصحاب کی آنکھیں جھکی ہوں گی اور اسی وجہ سے ابصار کی نسبت اصحاب کی طرف کرنے کی بجائے دلوں کی طرف کردی گئی ہے یعنی جزء بول کر کل مراد لیا ہے۔

﴿ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ﴾

(کافر کہتے ہیں کیا ہم پلٹائے جائیں گے الٹے پاؤں) پہلی حالت میں وہ اس سے موت کے بعد زندگی مراد لیتے ہیں اور یہ عربوں کے قول رجع فلان فی حافرۃ سے ماخوذ ہے، فلاں جس راستے سے آیا تھا وہ اس پر لوٹ آیا۔ یعنی اس نے راستے میں اپنے قدموں کے نشان چھوڑے (یہاں راستہ کی صفت حافرۃ نسبت کی بناء پر ہے) جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے "عیشة راضية"

یا مفعول کو فاعل کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اسے فی الحفرہ بھی پڑھا گیا ہے (اس صورت میں محفورہ اسم فاعل کے معنی میں ہوگا) کہا جاتا ہے

حَفِرَتْ اسنانُه فَحَفَرْتُ حفرا و هی حفرة

﴿ءَ اِذَا كُنَّا﴾

((یعنی) جب ہم) امام نافع مدنی، ابن عامر شامی اور علی بن حمزہ کسائی کوفی نے خبر ہونے کی بناء پر اذا کنا پڑھا ہے (یعنی ان قراء نے جملہ خبریہ ہونے کی وجہ سے ہمزہ استفہام کے بغیر پڑھا ہے)

﴿ عِظَامًا نَّخِرَةً ﴾

(بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہوں گے) نَّخِرَةً کا معنی بالیۃ ہے یعنی بوسیدہ ہڈیاں، حجازیان (امام نافع مدنیاور ابن کثیر مکی)، امام ابوعمرو بن العلا البصری، امام ابن عامر شامی، امام حفص اور روح نَخِرۃ پڑھا ہے اور یہ زیادہ بلیغ ہے

سوال؛ نَخِرۃ۔ ناخرۃ سے کیسے بلیغ ہے؟

جواب؛ نَّخِرَة صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور صفت مشبہ میں دوام پایا جاتا ہے جبکہ ناخرۃ اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اسم فاعل میں صفت دوام نہیں پائی جاتی اس لیے صفت مشبہ کا صیغہ اسم فاعل سے بلیغ ہے

﴿ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ﴾

(بولے یہ واپسی تو بڑے گھاٹے کی ہوگی)

ذات خسران سے اس جانب اشارہ ہے کہ یہاں اسم فاعل نسبت کے معنی میں ہے (اس صورت میں معنی ہوگا ایسی واپسی جو گھاٹے والی ہوگی)

خاسرۃ اصحابھا سے اس جانب اشارہ ہے کہ خاسرۃ صفت اضافی ہے جس کا فاعل اصحابھا محذوف ہے (اس صورت میں معنی ہوگا ایسی واپسی جس کے اصحاب گھاٹے میں ہونگے)

آیت کا معنی یہ کہ کفار نے کہا اگر ہماری واپسی درست ہو تو ہم اس وقت واپسی کو جھٹلانے کی وہ سے خسارے میں ہوگے

(یہ کلام ان کی طرف سے حقیقت کا اعتراف نہیں بلکہ استہزاء ہے)

﴿فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾

((پس اس واپسی کے لیے) تو فقط ایک جھڑک کافی ہے) یہ کلام فعل محذوف کے متعلق ہے جو کہ لا تستصعبوها ہے ترجمہ یوں گا: تم موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو مشکل گمان نہ کرو بعث بعد الموت تو ایک چیخ کے ساتھ ہی وقوع پزیر ہو جائے گیا

اور چیخ سے مراد نفخہ ثانیہ ہی ہے

﴿فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ﴾

(پھر وہ فورا کھلے میدان میں جمع ہو جائیں گے)یعنی وہ فورا سطح زمین پر زندہ ہونگے بعد اس کے کہ وہ اس کے بطن میں مردہ تھے اور الساھرۃ سے مراد چٹیل،سفید،ہموار زمین ہے

سوال: چٹیل،سفید،ہموار زمین کو ساھرۃ کا نام دینے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اس زمین کو ساھرۃ کا نام اس وجہ سے دیا گیا ہے کیونکہ اس میں سراب چلتا ہے،اور یہ عربوں کے قول "عین ساھرۃ" سے ماخوذ ہے اور "عین ساھرۃ" ایسے چشمہ کو کہتے ہیں جس کا پانی جاری ہو اور اس کی ضد میں "عین نائمة" کہا جاتا ہے

("عین نائمة" ایسا چشمہ جس کا پانی ٹھہرا ہو ہو)

جواب دوم: اس زمین کو ساھرۃ کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ ایسی زمین پر سفر کرنے والا خوف کے مارے بیدار رہتا ہے

اور یہ بھی کہا گیا ہے ساھرۃ جہنم کا ایک نام ہے

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى﴾

((اے حبیب!) کیا پہنچی ہے آپ کو موسیٰ کی خبر؟) کیا آپ ﷺ کو موسی علیہ السلام کی خبر نہیں پہنچی جو آپ کو آپ کی قوم کے جھٹلانے پر تسلی دلائے اور ان کو اس جھٹلانے پر اس طرح دھمکی دے کہ انہیں بھی اسی طرح عذاب پہنچے گا جیسا عذاب وقوم موسیٰ میں سب سے بڑے شخص کو پہنچا تھا

﴿اِذْ نَادٰهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾

(جب ان کے رب نے انہیں طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا تھا (کہ)) اس کا بیان سورۃ طه میں گزر چکا ہے

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾

(جاؤ فرعون کے پاس وہ سرکش بن گیا ہے) یہ قول کے ارادہ پر ہے (یعنی اس سے پہلے قول سے مشتق فعل محذوف ہوگا اور یہ کلام اس قول کا مقولہ ہوگا) اور اسے أن اذھب بھی پڑھا گیا ہے کیونکہ ندا میں قول کا معنی پایا جاتا ہے (اس صورت میں ان مفسرہ ہوگا)

﴿فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى﴾

(پس (اس سے) دریافت کرو کیا تیری خواہش ہے کہ تو پاک ہو جائے) کیا تم اس بات کی طرف میلان رکھتے ہو کہ تم کفر و سرکشی سے پاک ہو جاؤ اور حجازیان (امام نافع مدنی ،ابن کثیر مکی)اور امام یعقوب حضرمی بصری نے اسے تشدید کے ساتھ تزّکی پڑھا ہے

﴿وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ﴾

(اور (کیا تو چاہتا ہے کہ) میں تیری رہبری کرو تیرے رب کی طرف) اور میں تیرے رب کی معرفت کی جانب تمہاری راہ نمائی کروں

الی معرفته کے الفاظ سے اس جانب اشارہ ہے کہ ربك سے پہلے معرفة کا لفظ محذوف ہے کیونکہ الی غایت انتہاء کے لیے آتا ہے اور غایت زمان و مکان کی ہوتی ہے جبکہ اللہ تعالی زمان و مکان سے مبراء ہے

﴿فَتَخْشٰى﴾ (تاکہ تو (اس سے) ڈرنے لگے)

سوال: یہ ڈرنا،خشیت کس طرح ظاہر ہوگی؟

جواب: واجبات کی ادائیگی اور حرام کردہ اشیاء کو ترک کرنے کے ساتھ کیونکہ خشیت معرفت کے بعد ہوتی ہے

یہ آیت گویا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان فقولا له قولا لیّنا کی تفصیل ہے (پھر اسے نرمی سے سمجھاؤ)

﴿فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى﴾

(پس آپ نے جا کر اسے بڑی نشانی دکھائی) (یہاں ایجاز کے طریقہ پر کلام محذوف ہے) یعنی موسیٰ علیہ السلام اس کی طرف گئے اور تبلیغ کی پھر اسے

بڑا معجزہ دکھایا اور وہ بڑا معجزہ لاٹھی کا سانپ بن جانا تھا

سوال: اس معجزہ کو الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى کہنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: اس کو الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ پہلا معجزہ تھا، نیز وہ تمام معجزات کی اصل تھا

یا اس سے مراد معجزات کا مجموعہ ہے

سوال: اگر اس سے مراد معجزات کا مجموعہ ہے تو اس صورت میں ''الآیات الکبریٰ'' ہونا چاہیے جبکہ یہاں الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى واحد مذکور ہے

جواب: یہ اپنی دلالت کے اعتبار سے آیت واحد کی طرح ہے۔

﴿فَكَذَّبَ وَعَصٰى﴾

(پس اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی) فرعون نے معجزات ظاہر ہونے اور امر ثابت ہو جانے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور اللہ کی نافرمانی کی

﴿ثُمَّ اَدْبَرَ﴾

(پھر روگرداں ہوا) اطاعت سے

﴿يَسْعٰى﴾

(فتنہ انگیزی میں) کوشاں ہو گیا) معاملہ کو باطل کرنے میں کوشاں ہو گیا یا وہ سانپ دیکھنے کے بعد مرعوب ہوتے ہوئے پیٹھ پھیر کر چلنے میں تیزی کرنے لگا

﴿فَحَشَرَ﴾

(پھر (لوگوں کو) جمع کیا) اس نے جادوگروں کو یا اپنے لشکروں کو جمع کیا

﴿فَنَادٰى﴾

(پس پکارا) اپنے گروہ میں یا تو خود پکارا یا کسی منادی نے ندا دی

امام صاحب اشارہ فرما رہے ہیں کہ نادی فعل یا تو اپنے حقیقی فاعل 'فرعون' کی طرف منسوب ہے یا مجاز عقلی کے قاعدہ پر سبب کی طرف منسوب ہے

﴿فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾

(اور کہا کیا میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں) ہر اس سے بڑا ہو جو تمہارے معاملات کا ذمہ دار ہے

﴿فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى﴾

(آخر کار مبتلا کر دیا اسے اللہ نے آخرت اور دنیا کے دوہرے عذاب میں) دار آخرت میں جلانے اور دار دنیا میں غرق کرنے کے ساتھ ایسی سختی سے پکڑا جو ہر دیکھنے اور سننے والے کے لیے باعث عبرت تھا، (اس صورت میں الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى دار موصوف محذوف کی صفت ہیں)

(یا یہ دونوں الکلمہ کی صفت ہیں اور الْاٰخِرَةِ سے مراد آخری کلمہ اور الْاُوْلٰى سے مراد پہلا کلمہ ہے) اس صورت میں معنی ہوگا اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے آخری کلمہ جو کہ یہی آیت ہے اور پہلے کلمہ اور وہ اس کا قول ماعلمت لکم من الہ غیری ہے کی وجہ سے پکڑا

یا پھر دنیا و آخرت میں عبرت ناک سزا دینے کے لیے پکڑا یا پہلے اور آخری کلمہ کی وجہ سے عبرت ناک سزا دینے کے لیے پکڑا

اور یہ بھی جائز ہے کہ نکال مصدر ہو جو اپنے فعلِ مقدر (نَكَّلَ) کا مفعول مطلق ہو جو کہ تاکید بیان کر رہا ہو

وضاحت

نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى کے متعلق مندرجہ ذیل احتمالات ہیں

1: الْاٰخِرَةِ اور الْاُوْلٰى دونوں دار موصوف محذوف کی صفت ہیں

اس صورت میں معنی ہوگا: دار آخرت میں جلانے اور دار دنیا میں غرق کرنے کے ساتھ ایسی سختی سے پکڑا جو ہر دیکھنے اور سننے والے کے لیے باعث عبرت تھا

2: اَلْاٰخِرَۃ اور اَلْاُوْلٰی دونوں الکلمہ کی صفت ہیں

اس صورت میں معنی ہوگا

اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے آخری کلمہ اور پہلے کلمہ کی وجہ سے پکڑا

پہلا کلمہ: ماعلمت لکم من الہ غیری (میں اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا)

دوسرا کلمہ: اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں)

3: نکال مفعول لہ ہے

اس کی دو صورتیں ہیں

(۱) اگر اَلْاٰخِرَۃ اور اَلْاُوْلٰی دار کی صفت ہو تو معنی ہوگا: اللہ نے دنیا و آخرت میں عبرت ناک سزا دینے کے لیے پکڑا

(۲) اگر اَلْاٰخِرَۃ اور اَلْاُوْلٰی، الکلمہ کی صفت ہو تو معنی ہوگا: اللہ نے پہلے اور آخری کلمہ کی وجہ سے عبرت ناک سزا دینے کے لیے سختی کے ساتھ پکڑا

4: نکال فعل محذوف (نَکَّلَ) کا مفعول مطلق ہے جو کہ تاکید بیان کرنے کے لیے ذکر کیا گیا ہے

اس صورت میں تقدیر کلام یوں ہوگا

فَاَخَذَہُ اللّٰہُ وَنَکَّلَہٗ نَکَالَ الْاٰخِرَۃِ وَالْاُوْلٰی

یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے پکڑا اور آخرت و دنیا میں عبرت ناک سزا دی یا پہلے اور آخری کلمہ کی وجہ سے عبرت ناک سزا دی

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّمَنْ یَّخْشٰی﴾

(بے شک اس میں بڑی عبرت ہے اس کے لیے جو اللہ سے ڈرتا ہے)

اس شخص کے لیے جس کی شان اللہ سے ڈرنا ہے

﴿ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا﴾

(کیا تمہیں پیدا کرنا مشکل ہے) (اشد بمعنی اصعب ہے) یعنی پیدا کرنا مشکل ہے

﴿اَمِ السَّمَآءُ﴾

(یا آسمان کا) پھر اللہ نے بیان فرمایا کہ اس نے آسمان کو کیسے پیدا فرمایا پس فرمایا ﴿بَنٰھَا﴾ (اس نے اسے بنایا) پھر اس کے بنانے کا بیان فرمایا پس فرمایا ﴿رَفَعَ سَمْکَھَا﴾ (اس کی چھت کو خوب اونچا کیا) یعنی زمین سے آسمان کی بلندی کی مقدار کو خوب اونچا بنایا یا پھر بلندی میں دور تک جانے والی اس کی موٹائی کو خوب اونچا بنایا

﴿فَسَوّٰھَا﴾

(پھر اس کو درست کیا) اس کو معتدل بنایا (یعنی عیوب و نقائص سے مبراء تخلیق کیا) یا اس کو ہموار بنایا یا اس کے کمال کو ستاروں، سیاروں اور دوسری اشیاء سے مکمل کیا یہ عربوں کے قول "سوی فلان امرہ" سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوا پنے کام کی اصلاح کرئے

﴿وَاَغْطَشَ لَیْلَھَا﴾

(اور تاریک کیا اس کی رات کو) اس کی رات کو تاریک کر دیا۔ یہ غطش اللیل سے ماخوذ ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب رات تاریک ہو

سوال: لیلھا میں ھا ضمیر کا مرجع السماء ہے تو رات کی نسبت آسمان کی طرف کرنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: آسمان کی طرف اضافت کرنا اس لیے ہے کیونکہ رات (فلک) آسمان کی حرکت کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے

﴿وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا﴾

(اورظاہر کیااس کے دن کو) آسمان کے سورج کی روشنی کوظاہر کردیا جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے و الشمس و ضحٰھا (اور قسم ہے سورج اور اس کی روشنی کی) ضحٰھا سے مراد سورج کی روشنی ہے اور اس سے مراد دن ہے

﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا﴾

(اور زمین کو بعد ازاں بچھا دیا) زمین کو پھیلا دیا اور اسے رہنے کے لیے بچھونا بنادیا

﴿اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا﴾

(نکالا اس سے اس کا پانی) چشمے پھوٹنے کے ساتھ

﴿وَ مَرْعٰهَا﴾

(اور اس کا سبزہ) اس کا سبزہ اور مرعیٰ اصل میں چراگاہ کو کہتے ہیں

سوال وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا اور اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰهَا کے درمیان حرف عطف کیوں ذکر نہیں کیا گیا؟

جواب: جملہ کا حرف عطف سے خالی ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ قد کے مضمر ہونے کے ساتھ حال واقع ہو رہا ہے یا الدحو کا بیان ہے

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا :متبوع مبین /اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰهَا :عطف بیان

﴿وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا﴾

(اور پہاڑ (اس میں) گاڑ دیے) پہاڑوں کو گاڑ دیا/ پختہ کیا اور اسے و الارضُ و الجبالُ مبتدا ہونے کی بناء پر رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ قرأت مرجوح ہے کیونکہ جملہ اسمیہ کا جملہ فعلیہ پر عطف نہیں ہوتا

﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ﴾

(سامان زیست ہے تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے) تمہارے اور تمہارے مویشیوں (چوپاؤں) کے لیے لطف اٹھانے کے لیے ہے

تمتیعاً سے اس جانب اشارہ ہے کہ متاعاً باب تفعیل کا مصدر ہے متع یمتع تمتیعاً و متاعاً ،جیسے سَلّمَ یُسَلِّمُ تَسْلِیماً و سِلاماً اور ترکیب کلام میں یہ مفعول لہ واقع ہو رہا ہے۔

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ﴾

(پھر جب آئے گی آفت) ایسی آفت/بلا/ تاریکی جو دوسری تمام مصیبتوں پر چھا جائے گی

﴿الْكُبْرٰى﴾

(سب سے بڑی) جو تمام مصیبتوں سے بڑی ہوگی اور یہ قیامت یا نفخہ ثانیہ یا وہ گھڑی ہے جس میں اھل جنت کی طرف اور اھل دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے

﴿یَوْمَ یَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى﴾

(اس دن انسان یاد کرے گا جو دھوڑ دھوپ اس نے کی تھی) یعنی اس طرح یاد کرے گا کہ وہ اسے اپنے نامہ اعمال میں لکھا ہوا دیکھے گا حالانکہ وہ اس کو اپنی حد درجہ غفلت کی وجہ سے یا لمبی مدت گزر جانے کی وجہ سے بھول چکا ہوگا اور یہ جملہ اذا جاءت کے جملہ سے بدل ہے اور ما سعی میں ما موصولہ ہے یا ما مصدریہ ہے

جب ما اسم موصول ہوگا تو ضمیر عائد محذوف ہوگی (ما سعیٰ لہ) اور جب ما مصدریہ موصول حرفی ہوگا تو ضمیر نکالنے کی ضرورت نہیں

﴿وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ﴾

(اور ظاہر کر دی جائے گی جہنم) ظاہر کر دی جائے گی

﴿لِمَنْ یَّرٰی﴾

(ہر دیکھنے والے کے لیے) ہر دیکھنے والے کے لیے اس طرح ظاہر کردی جائے گی کہ وہ کسی پر مخفی نہیں رہے گی (راء کی تخفیف کے ساتھ) بُـرِزَت ' اور (لمن یری کو) لمن رای اور ''تریٰ'' میں ھی ضمیر مستتر ''جحیم'' کی طرف راجع ہونے کی بناء پر لمن تریٰ بھی پڑھا گیا ہے

سوال: اگر تریٰ کا فاعل جہنم ہو تو جہنم کی طرف دیکھنے کی نسبت کرنا کیسے درست ہوگا؟

جواب: جہنم کی طرف دیکھنے کی نسبت مجازی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اذا رأتھم من مکان بعید (جب وہ ان کو دور سے دیکھے گی)

یا پھر تریٰ میں خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے یعنی جہنم کو ہر اس شخص کے لیے ظاہر کردیا جائے گا جس کو آپ ﷺ کفار کے لیے دیکھیں گے (اور فاذا جاء ت کا جملہ شرط ہے، جس کا جواب محذوف ہے) اذا کے جواب پر یوم یتذکر الانسان یا اس کے بعد کی تفصیل دلالت کررہی ہے (یعنی فَاَمَّا مَنْ طَغٰی)

﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰی﴾

(پس جس نے سرکشی کی ہوگی) یہاں تک کہ اس نے کفر کیا

﴿وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا﴾

(اور ترجیح دی ہوگی دینوی زندگی کو) اس میں منہمک رہا اور عبادت اور نفس کی تہذیب کے ساتھ آخرت کے لیے تیار نہ ہوا

﴿فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی﴾

(تو دوزخ ہی (اس کا) ٹھکانا ہوگا) یہ اس کا ٹھکانہ ہوگا اور الماویٰ کے آخر سے ضمیر کو حذف کرکے اس پر الف لام اضافت کے قائم مقام کیا گیا ہے یہ بات معلوم ہونے کی وجہ سے کہ اس صاحب ماوی سرکش ہی ہوسکتا ہے اور ھی ضمیر یا تو ضمیر فصل ہے یا یہ مبتدا ہے

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ﴾

(اور جو ڈرتا رہا اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے) اپنے رب کی بارگاہ میں کھڑا ہو کر ڈرتا ہوگا کیونکہ اس کو اپنی ابتدا (پیدائش) اور دوبارہ زندہ ہونے کا علم تھا

﴿وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی﴾

(اور (اپنے) نفس کو روکتا رہا ہوگا (ہر بری) خواہش سے) کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ (اپنے رب کی طرف) لوٹ کر جانے والا ہے

﴿فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی﴾

(یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانا ہوگا) اس کے لیے جنت کے سوا کوئی اور ٹھکانہ نہیں ہوگا

﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ اَیَّانَ مُرْسٰھَا﴾

(یہ لوگ آپ سے قیامت کت بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب قائم ہوگی) اس کا وقوع ہونا یعنی اس کا قائم کیا جانا اور وجود میں لایا جانا کب ہوگا (اس صورت میں مُرسیٰ مصدر میمی ہوگا)

یا اس کی انتہاء اور قرار پذیر ہونے کا وقت کب ہوگا (یہ اس صورت میں ظرف ہوگا) اور مرسی السفینہ سے ماخوذ ہوگا اور اس کا معنی یہ ہے جہاں کشتی رکتی اور ٹھہرتی ہے

﴿فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰھَا﴾

(اس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق؟) آپ کو کیا پڑی ہے کہ آپ ان کے لیے اس کا وقت بیان کرتے رہیں یعنی آپ کو ذکر کرنے اور اس کا وقت بیان کرنے میں کوئی شئی نہیں (یعنی آپ کا کوئی تعلق نہیں کہ آپ ان کے لیے اس کا ذکر کریں اور اس کا وقت بیان کریں)

اس کا ذکر ان کی سرکشی میں ہی اضافہ کرے گا جبکہ اس کا وقت ایسی چیز ہے جس کو اللہ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ (فیم الگ کلام

ہے جو) ان کے سوال کا انکار ہے اور انت من ذکرھا (الگ کلام ہے جو کہ) جملہ متانئفہ ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ آپ بذات خود قیامت کی علاماموں میں سے ایک علامت ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کو خاتم الانبیاء بنا کر مبعوث کیا جانا قیامت کی علامات میں سے ایک علامت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فِيمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا کا جملہ ان کے ساتھ متصل ہے اور اس کا جواب یہ ہے ﴿اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا﴾ (آپ کے رب تک اس کی انتہا ہے) یعنی اس کے علم کی انتہاء ہے

﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا﴾

(آپ ضرور خبر دار کرنے والے ہیں ہر اس شخص کو جو ڈرتا ہو) آپ کو ہر اس شخص کو ڈرانے کے لیے مبعوث کیا گیا ہے جو قیامت کی ہولنا کی سے ڈرتا ہو اور اس ڈرنے کے لیے وقت کی تعیین مناسب نہیں

سوال: یہاں انذار کو اس شخص کے ساتھ ہی خاص کیوں کیا گیا ہے جو قیامت سے ڈرتا ہے حالانکہ نبی کریم ﷺ تمام لوگوں کو خبر دار کرنے والے ہیں؟

جواب: قیامت سے ڈرنے والے کے ساتھ انذار کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ صرف وہی اس سے فائدہ اُٹھانے والا ہے

امام ابو عمرو بن العلا البصری سے مُنْذِر تنوین کے ساتھ اور اصل پر اعمال کے ساتھ مروی ہے کیونکہ منذر حال کے معنی میں ہے (اور جب اسم فاعل حال کے معنی میں ہو تو وہ عاملہ ہوتا ہے: تنوین کی صورت میں من مَنْ يَّخْشٰى منذر کا مفعول ہوگا

﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا﴾

(گویا وہ جس روز اس کو دیکھیں گے (انھیں یوں محسوس ہوگا) کہ وہ دنیا میں نہیں ٹھہرے تھے مگر) دنیا میں یا قبروں میں

﴿اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا﴾

(ایک شام یا ایک صبح) یعنی دن کی ایک شام یا اس کی ایک صبح جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **الا ساعة من نہار** اور اسی وجہ سے **ضحی کو العشیة** (شام کی طرف منسوب کیا گیا ہے کیونکہ شام اور صبح دونوں ایک دن کا ہی جزء ہیں)

سورۃ نمبر 03	سورہ عبس	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	کل آیات 42

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى﴾

(چیں بہ جبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا (اس وجہ سے کہ) ان کے پاس ایک نابینا آیا)

روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے درآنحالیکہ آپ ﷺ کے پاس قریش کے سردار موجود تھے اور حضور ﷺ ان کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے پس صحابی رسول ﷺ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے وہ احکام امور سکھائے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سکھائے ہیں اور اس بات کو مکرر (دھرایا) اس بات کا اصرار کیا اور قوم کے ساتھ آپ ﷺ کی مشغولیت کو نہ جانا پس اس کی قطع کلامی کو رسول اللہ ﷺ نے ناپسند فرمایا اور چیں جبیں ہوئے اور ان سے رخ انور پھیر لیا (اس وقت) یہ آیت کریمہ نازل ہوئی رسول اللہ ﷺ ان کی عزت فرماتے اور جب آپ ﷺ انہیں دیکھتے تو فرمایا کرتے تھے مرحبا جس کے بارے میں میرے رب نے مجھے عتاب فرمایا اور آقا دو عالم ﷺ نے دو مرتبہ انہیں مدینہ کا خلیفہ مقرر فرمایا (لیکن یہ عدد درست نہیں غالبا آپ کو ۱۶ دفعہ مدینہ کا منصب خلافت سونپا گیا (اور مبالغہ کے لئے عبس کو عَبَّس تشدید کے ساتھ پڑھا گیا ہے کیونکہ (زیادۃ الفاظ تدل علی زیادہ المعنی) اور ان جاء دونوں مذہبوں کے اختلاف کی وجہ سے تولی کے لئے یا عبس کے لئے علت ہے۔

پہلا مذہب: بصریوں کا ہے ان کے نزدیک ''ان جاء'' سے پہلے لام محذوف ہوگا اور یہ تولی کے متعلق ہوگا۔

دوسرا مذہب: کوفیوں کے نزدیک ''ان جاء'' سے پہلے لام محذوف ہوگا اور یہ عبس کے متعلق ہوگا کوفیوں اور بصریوں کی اس اختلاف کی وجہ جاننے کے لئے ملاحظہ فرمائیں (هداية النحو)

''ان جاء'' کو دو ھمزوں اور ان کے درمیان الف کے ساتھ پڑھا گیا ہے (تو معنی ہوگا) کیا اس وجہ سے آقا دو عالم ﷺ چیں بہ جبیں ہوئے کہ آپ ﷺ نابینا آیا؟

سوال: صحابی رسول ﷺ کی صفت اعمٰی کو کیوں ذکر فرمایا؟

جواب: قوم کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے قطع کلامی پر پیش قدمی کرنے پر اس کے عذر کا شعور لانے کے لئے (صفت اعمٰی) کو ذکر فرمایا ہے۔

جواب دوم: یا اس بات پر دلالت کرنے کے لئے صفت اعمٰی کو ذکر فرمایا کہ وہ نرمی اور شفقت کا زیادہ حق دار ہے۔

جواب سوم: یا انکار کی زیادتی کی وجہ سے صفت اعمٰی کو ذکر فرمایا گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا! آپ ﷺ نے اس کے نابینا ہونے کی وجہ سے رخ انور پھیر لیا جیسا کہ اس فرمان میں التفات ہے۔

﴿وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى﴾

(اور آپ کیا جانیں شاید وہ پاکیزہ تر ہو جاتا) یعنی کونسی چیز نے آپ ﷺ کو اس کی حالت کے بارے میں جاننے والا بنا دیا شاید کہ وہ آپ ﷺ سے جو تعلیمات حاصل کر رہا ہے اس کے سبب وہ گناہوں سے پاک ہو جائے۔ اور اس بات میں اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا رخ انور پھیر لینا (وقتی طور پر اعراض فرمانا) دوسروں کی پاکیزگی کے لئے تھا۔

یعنی حضور ﷺ نے یہ عمل ذات کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ یہ عمل دوسروں کی پاکیزگی کے لئے فرمایا اے مالک دو جہاں! تیرا شکر ادا کرتے ہیں کہ تو نے ہم گناہ گاروں کو ایسا جلیل القدر محبوب عطا فرمایا۔

﴿اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى﴾

(یا وہ غور و فکر کرتا تو نفع پہنچاتی اسے یہ نصیحت) یعنی وہ نصیحت حاصل کرتا ہے پس آپ ﷺ کی نصیحت اس فائدہ دے اور کہا گیا ہے کہ لعلہ میں "ہ" کا مرجع کافر ہے (معنی ہوگا) یعنی آپ ﷺ نے اسلام اور وعظ و نصیحت کے ساتھ کافر کے تزکیہ میں طمع فرمایا اور اسی وجہ سے آپ ﷺ نے دوسرے لوگوں سے اعراض فرمایا آپ ﷺ کو کس چیز نے دی کہ جس بات میں آپ ﷺ طمع فرماتے ہیں وہ ہو کر رہنے والی ہے؟

اور عاصم نے لعل کا جواب بناتے ہوئے نصب کے ساتھ پڑھا ہے (جو کہ ہماری قرأت ہے گویا کہ امام بیضاوی کی قرأت رفع کے ساتھ ہے یعنی فتنفعہ۔

﴿اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى﴾

(لیکن وہ جو پروا نہیں کرتا آپ اس کی طرف تو توجہ کرتے ہیں) اس کی جانب توجہ کرتے ہوئے اس سے ملتے ہیں اور تصدی کی اصل تتصدی ہے (یعنی تصدی فعل مضارع کا صیغہ واحد مذکر مخاطب ہے اور یہ اصل میں تتصدی تھا ت کو ص میں بدل کر ص کو ص میں ادغام کر دیا مزید وضاحت تسہیل الصرف قاعدہ نمبر صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

ابن کثیر مکی اور نافع مدنی نے ادغام کے ساتھ تصدی پڑھا ہے اور اسے تصدی بھی پڑھا گیا ہے۔

کتاب میں محشی نے تصدی (ای بضمۃ التاء و سکون الصاد لکھا گیا ہے)

بقیہ یعنی تعرض و تدعی الی التصدی (اعراض کی جانب دعوت دی)

﴿وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى﴾

(اور آپ پر کوئی ضرر نہیں اگر وہ نہ سدھرے)

آپ ﷺ پر کوئی حرج نہیں کہ آپ ﷺ (کافر) کا اسلام کے ساتھ تزکیہ نہ فرمائے یہاں تک کہ کافر کے اسلام لانے پر آپ ﷺ کا حریص ہونا اس شخص سے اعراض پر ابھارے جو اسلام لایا ہے۔ آپ ﷺ پر صرف پیغام ہی پہنچانا ہے۔

﴿وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى﴾

(اور جو آپ کے پاس آیا ہے دوڑتا ہوا) خیر کو جلدی طلب کرتے ہیں۔

﴿وَهُوَ يَخْشٰى﴾ (اور وہ ڈر بھی رہا ہے) (یخشی) فعل متعدی ہے جس کا مفعول محذوف ہے اس کے بارے میں علامہ بیضاوی رحمہ اللہ تعالیٰ تین

احتمالات ذکر فرماتے ہیں۔

1: اللہ سے ڈر رہا ہے۔

2: آپ ﷺ تک پہنچنے میں کفار کی اذیتوں سے ڈر رہا ہے۔

3: راستہ کے دشوار (ناہموار) ہونے سے ڈر رہا ہے کیونکہ وہ نابینا ہے۔
اس کے لئے کوئی راہنمائی کرنے والا موجود نہیں۔

﴿فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى﴾

(تو آپ اس سے بے رخی برتتے ہیں) یعنی مشغول ہوتے ہیں کہا جاتا ہے لھی عنہ، التھی اور تلھی (یعنی ان تینوں کا ایک ہی معنی ہے) اور شاید تصدی اور تلھی کا ذکر کرنا اس بات کا شعور دلانے کے لئے ہے کہ عتاب غنی کی جانب دل کے متوجہ ہونے کی وجہ سے اور فقیر سے رخ انور پھیر لینے کی وجہ سے ہو اور آپ ﷺ جیسی عظیم الشان بلند صفات والی ہستی کے شایان شان نہیں ہے۔

﴿كَلَّآ﴾

(ایسا نہ چاہیے) اس کے بارے میں دو احتمال ہیں۔

1: اگر یہ آیت اسی وقت نازل ہو تو "کلا لردع عن المعاتب علیه "ان امور سے روکنا ہے جو عتاب کا سبب ہیں۔

2: اگر یہ آیت اس واقعہ کے بعد نازل ہوئی تو کلا لردع عن معاودة مثله یعنی اس بات سے روکنا ہے کہ ایسا فعل دوبارہ سرزد نہ ہو

﴿اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ﴾

(یہ تو نصیحت ہے سو جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے)

یعنی اسے یاد کرلے یا اس سے نصیحت حاصل کرلے اور اس آیت میں ''ھا'' اور ''ہ'' دونوں ضمیر قرآن کی طرف راجع ہیں یا عتاب مذکور کی طرف راجع ہیں۔

سوال: اگر دونوں ضمیروں کا مرجع ایک ہی ہے تو ایک ہی چیز کی طرف ایک مرتبہ مؤنث اور ایک مرتبہ مذکر کی ضمیر لوٹانا کیونکر درست ہے؟

جواب: پہلی ضمیر کو مؤنث ذکر کرنا اس کی خبر کے مؤنث ہونے کی وجہ سے ہے۔
انھا کی ''ھا'' ضمیر اور ذکرہ کی ''ہ'' ضمیر قرآن کی طرف راجع ہیں اور انھا کی خبر تذکرہ ہے۔

﴿فِیْ صُحُفٍ﴾

(یہ ایسے صحیفوں میں (ثبت) ہے)

صحیفوں میں موجود (چنتہ ہیں یہ تذکرہ کی صفت ہے اور خبر ثانی ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے (ھو فی صحف)۔

﴿مُّكَرَّمَةٍ﴾

(جو معزز (ہیں)) اللہ کے نزدیک (ہاں) پاس۔

﴿مَّرْفُوْعَةٍ﴾

(جو بلند مرتبہ) بلند مرتبے والے ہیں۔

﴿مُّطَهَّرَةٍ﴾

(پاکیزہ (ہیں)) شیطانوں کے ہاتھوں سے منزہ (پاک ہیں)

﴿بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ﴾

(ایسے کاتبوں کے ہاتھوں سے لکھے ہیں) یعنی فرشتوں یا انبیاء میں سے لکھنے والے جو لوح محفوظ سے یا وحی سے لکھتے ہیں۔

یا وہ سفیر جو اللہ تعالیٰ اور رسولوں کے مابین یا امت کے درمیان سفارت کرنے والے ہیں (اس صورت میں اس سے مراد رسول ہوں گے) اور سفرۃ سافر کی جمع ہے جو سفر یا السفارۃ سے ماخوذ ہے اور س، ف، ر، کی ترکیب میں کشف کے معنی پایا جاتا ہے۔ سفرت المرأۃ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب عورت (دوشیزہ) اپنا چہرہ سے نقاب ہٹائے۔

﴿كِرَامٍ﴾

(جو بڑے بزرگ) اللہ کی بارگاہ میں عزت والے ہیں یا مؤمنین پر بڑھا مہربان ہیں کہ انہیں پایہ کمال تک پہنچاتے ہیں اور ان کے لئے طلب کرتے ہیں۔

﴿بَرَرَةٍ﴾

(نیکوکار (ہیں)) متقی (پرہیزگار) ہیں۔

﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ﴾

(غارت ہو (منکر) انسان! وہ کتنا احسان فراموش ہے) انسان پر بدترین بدعا ہے اور ما اکفرہ میں اس کے حد درجہ کفر پر تعجب کا اظہار ہے اور یہ کلام اپنے اختصار مختصر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی ناراضگی اور بہت زیادہ مذمت پر دلالت کرتا ہے۔

﴿مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ﴾

(کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا) یہ بیان ہے اس نعمت کا جو اس پر کی گئی ہے خصوصا اس کی پیدائش کی ابتدا سے۔

اور استفہام حقارت کے لئے ہے اور اسی وجہ سے اللہ رب العزت نے اس کا جواب اپنے فرمان کے ساتھ دیا ہے۔

﴿مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ﴾

(ایک بوند سے اسے پیدا کیا پھر اس کی ہر چیز اندازہ سے بنائی) اس کو تیار کیا اور ان چیزوں (اشیاء) کے لئے جو اعضاء و اشکال میں سے مناسب تھیں یا اسے مختلف مراحل سے گزارا یہاں تک کہ اس کی تخلیق کو مکمل فرمایا۔

﴿ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ﴾

(پھر (زندگی کی) راہ اس پر آسان کر دی) ماں کے بطن سے نکلنے کے عمل کو آسان بنایا رحم کے منہ کھولنے کے ساتھ اور اس بات کا ابہام کرنے کے ساتھ کہ وہ سر کے بل نکلے۔ یا اس کے لئے خیر اور شر (اچھائی اور برائی کے ساتھ راستہ کو نرم بنا دیا اور السبیل کو ایسے فعل کے ساتھ نصب دی گئی ہے جس کی تفسیر فعل ظاہر ''یسرہ'' بیان کر رہا ہے آسانی میں (تعبیر میں) مبالغہ کے لئے اور السبیل کو اضافت کی بجائے الف لام کے ساتھ بنانا اس چیز کا شعور دلانے کے لئے ہے کہ سبیل سے مراد راستہ ہے اور آخری معنی کی صورت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا ایک گزرگاہ (راستہ) ہے اور منزل مقصود کچھ اور ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا۔

﴿ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ﴾

(پھر اسے موت دی اور اسے قبر میں پہنچا دیا پھر جب چاہے گا اسے دوبارہ زندہ کر دے گا)

اور موت دینا اور قبر میں داخل کرنے کو نعمتوں میں شمار فرمایا کیونکہ موت دینا حیات ابدی اور خالص لذات تک پہنچنے کا وسیلہ ہے (ذریعہ) ہے اور قبر میں داخل کرنا عزت افزائی فرمانا ہے اور درندوں سے حفاظت فرمانا ہے (یعنی اس مالک رحیم نے انسان کو صرف تخلیق ہی نہیں فرمایا بلکہ مرنے کے بعد بھی اپنی تخلیق کو عزت عطا کرتے ہوئے اور درندوں سے حفاظت فرماتے ہوئے زمین میں محفوظ فرما دیا۔

اور ''اذا شاؤ'' میں اس بات کا شعور دلانا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا وقت فی نفسہ متعین نہیں ہے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کی مشیئت پر موقوف ہے۔

﴿كَلَّا﴾

(یقیناً) انسان کو جھڑکنا ہے اس چیز (حالت سے جس پر وہ موجود ہے)

﴿لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ﴾

(وہ بجانہ لایا جو اللہ نے اسے حکم دیا تھا) حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر ابھی تک کسی شخص نے اس امر کو کلی طور پر پورا نہیں کیا جس کا اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم فرمایا تھا کیونکہ کوئی انسان کوتاہی سے خالی نہیں ہوتا۔ (بعد: ابھی تک)

﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ﴾

(پھر ذرا انسان غور سے دیکھے اپنی غذا کو) نعمت ذاتیہ کے پیچھے نعمت خارجیہ کو ذکر فرمایا۔

1: نعمت ذاتیہ: وہ نعمتیں جن کا تعلق انسانی ذات سے ہے مثلا اس کے لئے ماں کے بطن سے خروج کو آسان بنا دیا وغیرہ۔

2: نعمت خارجیہ: وہ نعمتیں ہیں جن کا تعلق خارج کے ساتھ ہے مثلا آسمان، ستارے، چاند وغیرہ۔

﴿اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا﴾

(بے شک ہم نے زور سے پانی برسایا) یہ جملہ مستانفہ ہے اور طعام کے پیدا ہونے کی کیفیت کو بیان کر رہا ہے اور کوفیوں نے طعامہ سے بدل اشتمال بناتے ہوئے فتح کے ساتھ پڑھا ہے (جو کہ ہماری قرأت ہے) لیکن امام بیضاوی کی قرأت اِنّ ہے کیونکہ ان کے نزدیک ہے جملہ مستانفہ ہے اور ابتدائے کلام میں ان پڑھا جاتا ہے۔

﴿ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا﴾

(پھر اچھی طرح پھاڑا زمین کو) نباتات کے ساتھ یا ہل چلانے کے ساتھ اور اللہ نے پھاڑنے کو اپنی ذات کی طرف منصوب کیا ہے جیسے فعل کی نسبت اس کے سبب کی طرف ہوتی ہے۔

﴿فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا﴾

(پھر ہم نے اگایا اس میں غلہ) جیسے گندم اور جو۔

﴿وَّعِنَبًا وَّ قَضْبًا﴾

(ورانگور اور ترکاریاں) یعنی سرسبز سبزیاں، قضبا، قضبہ کا مصدر ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی چیز کو کاٹے ترکاریوں (سبزیوں) کو قضب مصدر کا نام اس لئے دیا ہے کیونکہ انہیں ایک مرتبہ کے بعد دوسری مرتبہ کاٹ لیا جاتا ہے (جیسے پالک وغیرہ)

﴿وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا﴾

(اور گھنے باغات اور زیتون اور کھجوریں) یعنی بہت بڑے بڑے باغات۔

سوال: حدائق کی صفت ''غلب'' کس اعتبار سے بیان کی گئی ہے؟

جواب: باغات کا وصف غلب کے ساتھ یا تو ان کے گھنے ہونے اور ان کے درختوں کی کثرت کی وجہ سے فرمایا یا اس وجہ سے کہ باغات ایسے درختوں والے ہیں جو کہ موٹے تنوں والے ہیں اور یہ وصف الرقاب سے مستعار لیا گیا ہے۔

﴿وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا﴾

(اور (طرح طرح کے) پھل اور گھاس) چراگاہ یہ اَب سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی کام کا قصد کرے اور چراگاہ کو اب اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی جانب مویشی لے جانے کا قصد کیا جاتا ہے اور گھاس کاٹنے کے لئے جایا جاتا ہے یا یہ ''اب لکذا سے ماخوذ ہے'' اور اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی کسی مقصد کے لئے تیار ہو جائے اس معنی کے اعتبار سے) چراگاہ کو اب اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ جانوروں کو چرانے کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

یا پھر فاکھہ سے مراد تر پھل ہیں اور اب سے مراد ایسے پھل (خشک میوہ جات) ہیں جنہیں سردیوں کے لئے خشک کیا جاتا ہے

﴿مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ﴾ (سامان زیست ہے تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے)

مذکورہ انواع ان میں سے بعض ایسی ہیں جو بطور غذا استعمال ہوتی ہیں اور بعض ایسی ہیں جو بطورہ چارہ استعمال ہوتی ہیں

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ﴾

(پھر جب کان بہرا کرنے والا شور اٹھے گا)

یعنی نفخہ کو مجازی طور پر صاخہ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے لوگ بہرے ہوجائیں گے۔

﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ﴾

(اس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بچوں سے) اپنی حالت میں مشغول ہونے کی وجہ سے یا یہ بات نفع نہیں دے گی یا اس خوف سے کہ وہ (عزیزو اقارب) ان چیزوں کا مطالبہ نہ کردیں جو اس نے ان کے حق میں کوتاہی کی تھی۔

سوال: اس آیت کریمہ میں مالک ذوالجلال نے ترتیب کو ذکر نہیں فرمایا اس میں کیا حکمت عملی پوشیدہ ہے؟

جواب: محبوب رشتہ کے بعد اس سے زیادہ محبوب رشتہ کو مبالغہ کے لئے ذکر فرمایا گویا کہ کہا گیا ہے کہ انسان بھاگے گا اپنے بھائی سے نہیں بلکہ اپنے والدین سے نہیں بلکہ اپنی بیوی اور بچوں سے۔

﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ﴾

(ہر شخص کو ان میں سے اس دن ایسی فکر لاحق ہوگی جو اسے (سب سے) بے پروا کردے گی) یعنی اس میں اس کے مشغول ہونے میں وہ اسے کافی ہوگئی اور اسے یعنیہ (عین کی جگہ عین) کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی اس کو غم میں ڈال دے گی۔

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ﴾

(کتنے ہی چہرے اس دن (نور ایمان سے) چمک رہے ہوں گے ہنستے ہوئے خوش وخرم) روشن مسفرہ کا معنی بتا رہے ہیں یہ اسفر الصبح سے ماخوذ ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب صبح خوب روشن ہوجائے۔

﴿وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ﴾

(اور کئی منہ اس دن غبار آلود ہوں گے) ان نعمتوں کی وجہ سے جنہیں وہ دیکھیں گے۔

﴿تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ﴾

(ان پر کالک لگی ہوگی) گرد وغبار اور نحوست (شرمندگی) ان کے چہروں پر چھائی ہوگی

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ﴾

((یہی کافر (و) فاجر لوگ ہوں گے) سیاہی اور ظلمت چھارہی ہوگی)

پس یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کی جانب فجور کو جمع کیا اور اسی وجہ سے ان کے چہروں کی سیاہی کی جانب گرد وغبار (نحوست) شرمندگی کو جمع کردیا جائے گا۔

سورۃ نمبر 04	سورۃ تکویر	بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	کل آیات29

﴿اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ﴾

((یاد کرو) جب سورج لپیٹ دیا جائے گا) اس کے بارے میں دو احتمال ہیں

پہلا احتمال: کورت کا معنی لغت بیان کیا جارہا ہے، جس کا معنی ہے، لپیٹ دیا جائے گا یہ کورت العمامه سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت معنی بولا جاتا ہے جب آپ پگڑی (عمامہ) کو لپیٹتے ہیں اس وقت معنی یہ ہوگا کہ بلند کر دیا جائے گا کیونکہ جب کپڑے کو اٹھانے کا ارادہ کیا جاتا ہے تو اسے لپیٹ دیا جاتا ہے۔

(اس عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ کورت اپنے اصلی معنی میں مستعمل نہیں ہے بلکہ مجازی معنی میں استعمال ہورہا ہے)

دوسرا احتمال: سورج کی روشنی کو لپیٹ دیا جائے گا آفاق میں اس کا پھیلاؤ ختم ہوجائے گا اور اس کا اثر زائل ہوجائے گا۔

اس صورت میں الشمس سے پہلے "ضوء" کا لفظ محذوف ہوگا اور اس عبارت میں اس جانب بھی اشارہ ہے کہ کورت اپنے اصلی معنی میں مستعمل ہے۔

یا سورج کو اس کے مدار سے گرادیا جاتا جائے گا یہ عربوں کے قول طعنه فکوره سے ماخوذ ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی کو مجتمع کر کے اٹھا کر پھینک دے۔

اس نے فلاں کو نیزہ مارا اور وہی ڈھیر کر دیا۔

اور ک، و، ر کی ترکیب گھمانے اور جمع کرنے کے لئے ہے (یعنی جب کسی فعل میں یہ تین حروف بالترتیب آجائے تو اس فعل میں گھمانے اور جمع کرنے کا معنی پایا جاتا ہے)

سوال: الشمس کو کس بناء پر مرفوع پڑھا گیا ہے؟

جواب: الشمس کو ایسے فعل کے ساتھ رفع دینا جس کی تفسیر اس کا مابعد فعل بیان کررہا ہے، بہتر ہے۔

سوال: الشمس کو مبتدا ہونے کی بناء پر رفع کیوں نہیں دیا جاسکتا؟

جواب: کیونکہ اذا شرطیہ فعل کو طلب (فعل پر داخل ہوتا ہے) اصل عبارت یوں ہوگی "اذا کورت الشمس کورت "

﴿وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ﴾

(اور جب ستارے بکھر جائیں گے) ترجمہ: ٹوٹ گریں گے۔

سوال: انکدرت کا معنی انقضت کہاں سے ماخوذ کیا گیا ہے؟

جواب: کسی شاعر نے کہا! عقاب نے فضاء میں لٹیسر کو دیکھا پس وہ اس پر ٹوٹ پڑا۔

(یا انکدرت کا معنی اظلمت ہے) یعنی ستارے تاریک ہوجائیں گے اور یہ عربوں کے قول کدرت الماء فانکدرت سے ماخوذ ہے یعنی میں نے پانی کو گدلا کیا پس ہو گدلا ہوگیا۔

﴿وَاِذَا الۡجِبَالُ سُيِّرَتۡ﴾

(اور جب پہاڑوں کو اکھیڑ دیا جائے گا) زمین کی سطح پر یا فضاء میں۔

﴿وَاِذَا الۡعِشَارُ﴾

(اور جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں) ترجمہ: ایسی گابھن اونٹنیاں جن کی مدت حمل کو ۱۰ ماہ بیت گئے ہو اور عشار، عشراء کی جمع ہے۔

﴿عُطِّلَتۡ﴾

(چھٹی پھریں گی) مھمل / بے یارومددگار چھوڑ دیا جائے یا (عشار سے مراد) ایسے بادل ہیں جنہیں بارش سے خالی کر دیا گیا ہو اور اسے تخفیف کے ساتھ "عطلت" بھی پڑھا گیا ہے۔

﴿ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ﴾

(اور جب وحشی جانور یکجا کر دیے جائیں گے) ہر جانب سے جمع کر دیا جائے گا انہیں قصاص کے لئے دوبارہ زندہ کیا جائے گا پھر انہیں (قصاص کے بعد) مٹی بنا دیا جائے گا یا انہیں مار دیا جائے گا۔

یہ عربوں کے قول اذا اححضت السنة بالناس حشرتھم سے ماخوذ ہے (جب قحط سالی نے انہیں ہلاک کر دیا) عرب کہتے ہے حشرتھم "قحط سالی نے حشرتھم" جب قحط سالی لوگوں کو ہلاک کر ڈالے تو اس وقت عرب کہتے ہیں (حشرتھم "قحط سالی نے ہلاک کر دیا)۔اور اسے تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔(حُشِّرَت)

﴿ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ﴾

(اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے) گرم کر دیا جائے گا یا بعض کو بعض کی جانب جاری کرنے کے ساتھ بھر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ ایک ہی سمندر بن جائیں گے۔

تعود بمعنی صار ہے یہ عربوں کے قول سجر التنور سے ماخوذ ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص تنور کو لکڑیوں کے ساتھ بھر دے تا کہ وہ اسے گرم کرے اور ابن کثیر مکی اور ابوعمرع بصری اور روح نے تخفیف کے ساتھ (سجرت) پڑھا ہے۔

﴿ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ﴾

(اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑی جائیں گی) بدنوں کے ساتھ ملا دیا جائے گا یا ہر ایک اس کے ہم مثل کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔

یعنی اچھے لوگوں کو اچھے لوگوں کے ساتھ اور برے لوگوں کو برے لوگوں کے ساتھ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا

"من تشبه بقوم فهو منهم "

جو جس شخص کی مشابہت اختیار کرتا ہے پس قیامت کے دن وہ ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

"اللهم اعط حب الرسول ﷺ "

یا (ہر شخص کو اس کے نامہ اعمال کے ساتھ ملا دیا جائے گا یا مؤمنین کے) نفوس کی حوروں اور نفوسِ کفار کو شیاطین کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔

﴿ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ﴾

(اور جب زندہ درگور کی ہوئی (بچی) سے) زندہ درگور کی جانے والی بچی سے اور اھل عرب بچیوں کو مال کے خوف سے یا ان کی وجہ سے شرمندگی کے لاحق ہونے کی وجہ سے زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔

﴿ سُئِلَت بِاَیِّ ذَنۡبٍ قُتِلَت﴾

(پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے باعث ماری گئی)

سوال: سوال تو ظلم کرنے والے سے کیا جاتا ہے نہ کہ مظلوم سے تو اس مظلوم بچی سے سوال کیوں کیا جائے گا؟

جواب: یہ سوال کرن از زندہ درگور کرنے والے کو جھڑ کنے کے لئے ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے انصاری کو اپنے اس فرمان کے ساتھ جھڑکا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ارشاد فرمایا! کیا آپ نے لوگوں کو کہا کہ مجھے اپنا معبود بنالو؟

اور سئلت کو سألت بھی پڑھا گیا ہے یعنی وہ اپنے معاملہ کے بارے میں جھگڑا کرے گی اور اس بچی کے بارے میں خبر دی جانی کی بنا پر اسے قُتِلَت بھی پڑھا گیا ہے اور حکایت کے طور پر قُتِلتُ بھی پڑھا گیا ہے (یعنی وہ لڑکی پوچھے گی مجھے کس گناہ کی بناء پر قتل کیا گیا)

﴿ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾

(اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے) یعنی نامہ اعمال پس انہیں موت کے وقت لپیٹ دیا جاتا ہے اور حساب کے وقت بکھیر دیا جایا گا اور کہا ہے کہ

نشرت کا معنی انہیں ان کے اصحاب کے درمیان تقسیم کردیا جائے گا اور ابن کثیر مکی اور ابو عمرو بصری حمزہ کوفی اور کسائی نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

سوال: تشدید کی صورت میں باب تفعیل کس لئے استعمال ہوا ہے؟

جواب:

(۱) بکھیرنے میں مبالغہ کا اظہار کرنے کے لئے۔

(۲) یا کثرت صحف کی وجہ سے۔

(۳) یا صحیفوں کے بہت زیادہ اڑنے کی وجہ سے استعمال ہوا ہے۔

﴿ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴾

(اور جب آسمان کی کھال ادھیڑ لی جائے گی) اکھیڑ دی جائے گی یا زائل کر دی جائے گی جس طرح ذبح شدہ جانور سے چھڑی ادھیڑ دی جاتی ہے اور اسے ''قشطت'' بھی پڑھا ہے اور ''ق'' کی جگہ ''ک'' کا آنا کثیر ہے۔

﴿ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ﴾

(اور جب جہنم دہکائی جائے گی) بہت زیادہ بھڑکا دیا جائے گا۔

اور نافع مدنی، ابن عامر شامی اور حفص اور رویس نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے (جیسا کہ متن میں ہے گویا امام بیضاوی کی قرأت ''سعوت'' ہے)

﴿ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴾

(اور جب جنت قریب کر دی جائے گی) مؤمنین کے قریب کر دیا جائے گا۔

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ﴾

((تو اس دن) ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے) یہ جملہ اذا کا جواب ہے۔

سوال: اس زمانہ کا مذکورہ ۱۲ امور کی ظرف بننا کیسا ہے؟

جواب: علمت کا جزاء بننا صحیح ہے کیونکہ اذا سے مراد ایسا وسیع زمانہ مراد ہے جو ان تمام امور کو اور نفوس کو ان کے اعمال کی جزاء دینے (کے عمل) کو شامل ہوگا حالانکہ سیاق میں مذکورہ ۶ خصلتیں دنیا کے فناء ہونے سے پہلے قیام قیامت کی مبادیات میں سے ہیں اور ۶ خصلتین ان کے بعد کی ہیں۔

سوال: یہاں نفس کو نکرہ ذکر کرنے میں کیا حکمت کارفرما ہے؟

جواب: یہاں نفس کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے جو کہ عموم کے معنی میں ہے جیسے عربوں کا قول " تمرة خير من جرادة " (کھجور مکڑی سے بہتر ہے)

اس میں تمرہ اور جرادۃ دونوں نکرہ ہیں اور عموم کے معنی میں ہیں۔

﴿ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴾

(پھر میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والے تاروں کی) یعنی پلٹنے والے ستاروں کی یہ خنس سے ماخوذ ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی چیز پیچھے رہ جائے (مؤخر ہو جائے) اور یہ سورج اور چاند کے علاوہ دیگر ستارے ہیں۔

سوال: الخنس کے مفہوم میں سورج اور چاند کیوں شامل نہیں حالانکہ یہ بھی سیارے ہی ہیں؟

جواب: یہاں خنس سے مراد وہ سیارے ہیں جو سورج کی روشنی میں چھپ جانے والے ہیں لہٰذا چاند اور سورج کو ان میں شامل کرنا مناسب نہیں اسی وجہ سے اس کی صفت اپنے ارشاد کے ساتھ بیان فرمائی۔

﴿الْجَوَارِ الْكُنَّسِ﴾

((اور قسم کھاتا ہوں) سیدھے چلنے والے رک کے رہنے والے تاروں کی) یعنی ایسے سیارے جو سورج کی روشنی میں چھپ جاتے ہیں۔

اور یہ کنس الوحشی سے ماخوذ ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی وحشی جانور اپنی کناس (کچھار) میں داخل ہو جائے اور کناس جانور کا وہ گھر ہوتا ہے جو درختوں سے بنایا گیا ہو۔

﴿وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ﴾

(اور رات کی جب وہ رخصت ہونے لگے)

یعنی اس کی تاریکی آ رہی ہو یا اس کی تاریکی جا رہی ہو۔ اور عسعس کا لفظ اضداد (متضاد) میں سے ہے (یعنی اس میں دو متضاد معنی پائے جاتے ہیں) اور کہا جاتا ہے کہ عسعس اللیل و سعسع اس وقت بولا جاتا ہے جب رات جانے لگے۔

﴿وَ الصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ﴾

(اور صبح کی جب وہ سانس لے) یعنی جب اس کی دھندلاہٹ، ہوا اور بادِ نسیم کے آنے کے وقت روشن ہو رہی ہو۔ تنفس کا لفظ ذکر کر کے مجازی طور پر اس سے دھندلاہٹ کا روشن ہونا مراد ہے

﴿اِنَّهٗ﴾

(کہ یہ (قرآن)) ہ ضمیر کے مرجع کے بارے میں بتا رہے ہیں یعنی قرآن۔

﴿لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ﴾

(ایک معزز قاصد کا (لایا ہوا) قول ہے)

یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام

سوال حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف اس قول کی نسبت کیوں کی؟

جواب کیونکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس کو اللہ کی طرف سے کہا کرتے تھے/ لایا کرتے تھے

﴿ذِیْ قُوَّةٍ﴾

(جو قوت والا ہے) جیسے اللہ کا فرمان ہے "شدید القوی" (سخت طاقتور)

﴿عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ﴾

(مالک عرش کے ہاں عزت والا ہے) اللہ تعالیٰ کے ہاں شریف و مقام والے ہیں۔

﴿مُّطَاعٍ﴾

((سب فرشتوں کا) سردار) ملائکہ میں

﴿ثَمَّ اَمِیْنٍ﴾

(اور وہاں کا امین (ہے)) وحی پر اور ثم ماقبل و مابعد کے ساتھ متصل ہونے کا احتمال رکھتا ہے (یعنی جب ماقبل سے متصل ہوگا تو معنی ہوگا وہاں ان کی اطاعت کی جاتی ہے اور جب مابعد کے ساتھ ہوگا تو معنی ہوگا ''وہاں امین ہیں'' اور اسے ثُم بھی پڑھا گیا ہے۔ (اس صورت میں یہ حرف عطف ہوگا)

سوال: اوپر جو صفات ذکر کی گئی ہیں ان کے درمیان کوئی حرف عطف نہیں آیا تو پھر امین سے پہلے حرف عطف ذکر کرنے میں کیا حکمت عملی ہے؟

جواب: (امین سے پہلے حرف عطف) امانت کی تعظیم کے لئے اور دوسری صفت کو تمام صفات پر فضیلت دینے کے لئے ذکر فرمایا۔

یعنی ثم یہاں تراخی مرتبہ کے لئے نہیں بلکہ تراخی زمانہ کے لئے آیا ہے۔

﴿وَمَا صَاحِبُکُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴾ (اور تمہارا یہ ساتھی کوئی مجنون تو نہیں)

یعنی جس طرح کفار نے ان پر بہتان باندھا تھا اور اس آیت کے ساتھ حضور ﷺ پر جبرئیل علیہ السلام کے فضائل کو شمار کیا گیا ہے اور حضور ﷺ سے

صرف جنون کی نفی پر اقتصار کیا گیا اور یہ استدلال ضعیف ہے کیونکہ اس آیت سے مقصود کفار کے قول کی نفی ہے کہ حضور ﷺ وایک انسان (بشر) سکھاتا ہے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا ہے یا (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کو جنون ہے نہ کہ ان دونوں ہستیوں ک فضیلت کو شمار کرنا اور ان کے درمیان موازنہ کرنا مقصود ہے۔ لا تعداد کا عطف المقصود پر ہے۔

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ﴾

(اور بلاشبہ اس نے اس قاصد کو دیکھا ہے) یعنی رسول ﷺ نے جبرئیل کو دیکھا۔ راہ میں ھو ضمیر مستتر مرجع رسول ﷺ اور ہ ضمیر کا مرجع جبرئیل علیہ السلام ہیں۔

﴿بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ﴾

(روشن کنارے پر) سورج کے اعلی درجہ پر

﴿وَمَا هُوَ﴾

(اور نہیں یہ نبی) ھو ضمیر مستتر کا مرجع حضرت محمد ﷺ ہیں۔

﴿عَلَى الْغَیْبِ﴾

(غیب بتانے میں) اس چیز پر جس کی آپ ﷺ وحی میں سے اور اس کے علاوہ غیب میں سے خبریں دیتے ہیں۔

﴿بِضَنِیْنٍ﴾

(ذرا بخیل) تہمت نہیں لگائی گئی (اس صورت میں یہ) الظنة سے ماخوذ ہوگا جس کا معنی تہمت ہے اور نافع ''عاصم'' حمزہ'' ابن عامر نے "بضنین" پڑھا ہے اس وقت یہ الـضـمـن سے مشتق ہوگا جس کا معنی بخل ہے یعنی آپ ﷺ تعلیم و تبلیغ میں بخل سے کام نہیں لیتے (امام بیضاوی کی قرأت الظنة سے ہے) اور ضاد کا مخرج زبان کے کنارے کی جڑ اور وہ داڑھیں ہیں جو زبان کے دائیں بائیں ملی ہوئی ہیں۔ اور ظ کا مخرج طرف لسان اور ثنایا علیا کی جڑ ہے۔

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ﴾

(اور یہ (قرآن) کسی شیطان مردود کا قول نہیں) یعنی کسی ایسے شیطان کا قول نہیں جو سنے ہوئے قول کو چوری کرنے والا ہو۔ (السمع بمعنی مفعول مسموع ہے) اور یہ ان کے قول کی نفی کرنا ہے کہ یہ کہانت وجادو ہے۔

﴿فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ﴾

(پھر تم (منہ اٹھائے) کدھر چلے جارہے ہو) یہ ان کی طرف گمراہی کی نسبت کرنا ہے جس راستے میں وہ قرآن اور رسول ﷺ کے معاملہ کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ جس طرح کہ آپ کا سیدھا راستے کو چھوڑنے والے کو کہنا "این تذهبون" منہ اٹھائے کدھر جارہے ہو۔

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾

(نہیں ہے یہ مگر نصیحت سب اہل جہان کے لیے) امام بیضاوی کے نزدیک العالمین، لام کے کسرہ کے ساتھ ہے اس وجہ سے یہ معنی کیا۔ یہ نصیحت ہے اس شخص کے لئے جو اسے جاننے کی کوشش کرتا ہے۔

﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ﴾

((لیکن ہدایت وہی پاتا ہے) جو تم میں سے سیدھی راہ چلنا چاہے) یعنی حق کو تلاش کرنے اور درست اشیاء کو لازم پکڑنے کے ساتھ اور یہ عالمین سے بدل ہے نصیحت سے فائدہ حاصل کرنے والے یہی لوگ ہیں۔

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ﴾

(اور تم نہیں چاہ سکتے) تشائون فعل متعدی ہے جس کا مفعول الاستقامة محذوف ہے یعنی (اے لوگو جو استقامت کو چاہتے ہو تم اس کو نہیں چاہ سکتے)

﴿اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ﴾

(بجز اس کے اللہ چاہے) مگر اللہ تعالیٰ کا تمہاری مشیت کے چاہنے کے وقت، اسی کے لئے فضیلت ہے اور اسی کو تمہاری استقامت کا تم پر حق ہے (یعنی تمہاری استقامت کے ساتھ تم پر اسی کو فضیلت اور حق حاصل ہے)

﴿رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

(جو رب العالمین ہے) یعنی ساری مخلوق کا مالک ہے۔

سورۃ نمبر 05	سورہ الانفطار	بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	کل آیات 19

﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ﴾

(جب آسمان پھٹ جائے گا) یہاں انفطرت کا معنی انشقت کر رہے ہیں۔ یعنی پھٹ جائے گا۔

﴿وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ﴾

(اور جب ستارے بکھر جائیں گے) جدا جدا ہو کر گر / ٹوٹ جائیں گے س

﴿وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ﴾

(اور جب سمندر بہنے لگیں گے) بعض کو بعض کی جانب کھول دیا جائے گا (یعنی ان کے درمیان جو خشکی کے بند ہیں وہ ختم کر دیئے جائیں گے) پس تمام کے تمام ایک ہی سمندر بن جائے گا۔

﴿وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ﴾

(اور جب قبریں زیر و زبر کر دی جائیں گی) ان کی مٹی کو الٹ پلٹ دیا جائے گا اور قبروں کے مردوں کو نکالا جائے گا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ بعث اور اثارہ کی "را" سے مرکب ہے جیسے بسمل اور اس کی لفظی و معنوی مثال بعثر ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ بعثرت کا فعل ایجاز و اختصار کے طور پر دو لفظوں کا مرکب ہے ایک بعث اور دوسرا اثارہ کی راء۔

بعث کا معنی قبروں سے اٹھانا اور اثارہ کا معنی اڑا دینا ہے تو بعثر کا معنی ہوگا قبروں کی مٹی اڑا کر مردوں کو اٹھایا جائے گا۔

جیسے بسمل ہے جو کہ بسم اللہ کی بسم اور لفظ اللہ کے لام سے مرکب ہے۔

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ﴾

((اس وقت) جان لے گا ہر شخص جو (اعمال) اس نے آگے بھیجے تھے) عمل میں سے یا صدقہ میں سے۔

امام بیضاوی نے "عمل" کو نکرہ ذکر کیا یعنی اچھے اور برے اعمال سب کو دیکھ لے گا۔

﴿وَاَخَّرَتْ﴾

(اور جو (اثرات) وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا) راستہ میں سے یا مال میں سے۔

سنۃ: اگر کوئی اچھی رسم کا آغاز کیا ہوگا تو ثواب ملتا رہے گا یا کوئی مسجد وغیرہ بنوائی۔

برائی راستہ: یعنی کوئی ایسا گناہ کر لیا ہو جو ابھی تک جاری ہے تو اس کا گناہ اسے بھی ملتا رہے گا۔

اور جائز ہے کہ تاخیر سے مراد ضائع کرنا اور یہ اذا کا جواب ہے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ﴾ (اے انسان! کس چیز نے تجھے دھوکے میں رکھا اپنے رب کریم کے بارے میں) یعنی کون سی چیز ہے جس نے تمہیں دھوکہ میں مبتلا کر دیا اور اللہ کی نافرمانی پر جرأت مند (یعنی بہادر) بنا دیا۔

سوال: صفت کریم کوذکر کرنے میں کیا حکمت کارفرما ہے؟

جواب: کریم کی صفت دھوکہ کھانے میں روکنے سے منع کرنے میں مبالغہ کے لئے ذکر فرمائی کیونکہ محض کرم بھی ظالم کو مہلت دینے کا اور دوست اور دشمن، مطیع و نافرمان کے برابر ہونے کا تقاضہ نہیں کرتا تو پس کیا حال ہوگا جب اس کی ذات کے ساتھ صفت قہر اور انتقام لگام جائے۔

اور صفت کریم کا ذکر کرنا اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ یہ وہ صفت ہے جس کے ساتھ شیطان دھوکہ میں مبتلا کر دیتے ہیں شیطان اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو تم چاہتے ہو وہ کام کروں پس تمہارا رب کریم ہے وہ کسی ایک کو عذاب نہیں رہتا اور وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا اور اس بات پر دلالت کرنے کے لئے کہ اس کے کرم کی کثرت اس کی ااطاعت میں زیادہ کوشش کرنے کا تقاضہ کرتی ہے نہ کہ اس کے کرم سے دھوکہ کھاتے ہوئے اسکی نافرمانی ہونے میں منہمک ہونے کا تقاضہ کرتی ہے۔

﴿الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ﴾

(جس نے تجھے پیدا کیا پھر تیرے (اعضاء کو) درست کیا پھر تیرے (عناصر کو) معتدل بنایا) یہ دوسری صفت ہے جو کہ اس کی ربوبیت کو ثابت کر رہی ہے اور اس کے کرم کی وضاحت کر رہی ہے اس بات پر تشنیہ کر رہی ہے جو جو پہلی دفعہ اس بات پر قادر ہے وہ دوسری بار بھی درست اور اپنے منافع کی صلاحیت رکھنے والا بنانا ہے۔

اور تعدیل سے مراد ڈھانچہ بھی بنیادی چیزوں کو معتدل اور دوسرے اعضاء کے مناسب بنانا ہے یا تعدیل سے مراد یہ ہے کہ اعضاء کو ان قوتوں کے مناسب بنانا ہے جن کی صلاحیت ان میں رکھی گئی ہے۔

اور کوفیوں نے تخفیف کے ساتھ **فعدلك** پڑھا ہے۔

یعنی تمہارے بعض اعضاء کو ایک دوسرے کے مناسب بنایا یہاں تک کہ وہ معتدل ہوگئے (یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ) اس ذات نے تجھے دوسری کی خلقت سے جدا کر دیا اور تجھے ایسی خلقت کے ساتھ جو تمام دوسرے حیوانات سے جدا کر دیا۔

﴿فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ﴾

((الغرض) جس شکل میں تجھے چاہا ترکیب دے دیا)

بے شک جس صورت میں پایا ترکیب دیا اور ما زائدہ برائے تاکید ہے اور فی ای صورت کی ظرف یعنی جار مجرور عدک کا صلہ ہے (یعنی اس کے متعلق ہوگا

سوال: اس دو جملوں کے درمیان حرف عطف ذکر نہ کرنے میں کیا حکمت عملی ہے؟

جواب: جملہ **عدلك** متبوع نہیں کیا گیا کیونکہ یہ **عدلك** کے لئے بیان ہے (**یعنی عدلك متبوع مبین** اور **فی ای صورۃ ما شاء رکبك** عطف بیان ہے اور متبوع مبین اور عطف بیان کے درمیان حرف عطف نہیں آتا)۔

﴿كَلَّا﴾

(یہ سچ ہے) (کلام) اللہ کے کرم کے ساتھ دھوکہ کھانے سے جھڑکنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ﴾ (بلکہ تم جھٹلاتے ہو روز جزا کو) اس چیز کو بیان کرنے کا اضراب ہے جو ان جو ان کے دھوکہ کھانے کا اصلی سبب ہے (یعنی ان لوگوں کو اللہ کی صفت کریمی دھوکہ نہیں دے رہی بلکہ ان کے دھوکہ کھانے کا حقیقی سبب یہ ہے کہ روز جزاء کو جھٹلاتے ہیں اضراب سے مراد یہ ہے کہ سابقہ کلام کی نفی کی جائے اور مابعد کلام کو ثابت کیا جائے اور الدین سے مراد روز جزاء یا دین اسلام ہے۔

﴿وَاِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ كِرَامًا كَاتِبِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾

(حالانکہ تم پر نگراں (فرشتے) مقرر ہیں، جو معزز ہیں (حرف بحرف لکھنے والے ہیں، جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو)

یہ جس بات کو وہ جھٹلاتے ہیں اس کو ثابت کرنا ہے اور جو وہ درگزر کئے جانے اور مہلت دئے کی توقع رکھتے ہیں اس کو رد کرنا ہے فرشتوں کا اللہ کے ہاں

معزز ہونا ان کے عظیم ہونے کی وجہ سے ہے۔

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ﴾

(بے شک نیک لوگ عیش و آرام میں ہونگے اور یقیناً بدکار جہنم میں ہوں گے) یہ جس چیز کو بیان کرتا ہے جس کے لئے وہ لکھتے ہیں (یعنی ان کے لکھنے کا مقصد بیان کیا جارہا ہے)۔

﴿یَّصْلَوْنَهَا﴾

(داخل ہوں گے اس میں) وہ اس کی گرمی کو چکھیں گے۔(برداشت کریں گے)

﴿یَوْمَ الدِّیْنِ وَمَاهُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ﴾

(قیامت کے روز اور وہ اس سے غائب نہ ہوسکیں گے) کیونکہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور ایک معنی یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اس میں جانے سے پہلے بھی اس سے غائب نہیں ہوں گے کیونکہ وہ قبروں میں اس کی بادسموم (گرام ہوا) کو پاتے تھے۔

﴿وَمَآ اَدْرٰكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ثُمَّ مَآ اَدْرٰكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ﴾

(اور آپ کو کیا علم کے روز جزا کیا ہے؟ پھر آپ کو کیا علم کہ روز جزاء کیا ہے؟)

سوال: استفہامیہ انداز میں اور مکرر کلام کرنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: یہ اس کے اوپر تعجب کا اظہار کرنا ہے اور اس روز کی تفخیم شان کے لئے ہے یعنی اس روز کے معاملہ کی حقیقت کو کوئی نہیں جان سکتا اس طرح کہ کسی جاننے والے کی روایت اس کا ادراک نہیں کرسکتی۔

﴿یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا ؕ وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾

(یہ وہ دن ہوگا) جس روز کسی کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا اور سارا حکم اس روز اللہ ہی کا ہوگا) یہ اس روز کی ہولناکی کی شدت اور اس کے معاملہ کی عظمت کو پر بیان کرنا ہے اور ابن کثیر اور بصریان نے یوم کو یوم الدین سے بدل بناتے ہوئے یا مبتدا محذوف کی خبر بناتے ہوئے (مرفوع پڑھا ہے) رفع دیا ہے۔

سورۃ نمبر 06	سورہ المطففین	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	کل آیات 36

﴿وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ﴾

(بربادی ہے (ناپ تول میں) کمی کرنے والوں کے لیے) وزن کرنے اور ماپنے میں کمی کرنے کو تطفیف کہتے ہیں کیونکہ جو کمی کی جاتی ہے وہ تھوڑی ہوتی ہے (یعنی حقیر ہوتی ہے)

روایت کیا گیا ہے کہ اھل مدینہ ماپنے کے اعتبار سے سب سے زیادہ کمی کرنے والے لوگ تھے پس یہ سورۃ نازل ہوئی تو انہوں نے اپنی روش کو احسن بنالیا اور حدیث میں ہے کہ پانچ چیز پانچ کے بدلے میں ہیں (یعنی پانچ مصیبتیں (عذاب) یا پانچ اعمال کے بدلے میں ہیں۔ کوئی عہد شکنی نہیں کرتی مگر اللہ تعالیٰ ان پر ان کے دشمنوں کو مسلط کردیتا ہے اور وہ لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے بغیر فیصلہ نہیں کرتے مگر ان میں فقر عام ہوجاتا ہے ان میں فحاشی ظاہری نہیں ہوتی مگر ان میں موت عام ہوجاتی ہے اور وہ لوگ ماپنے میں کمی نہیں کرتے مگر نباتات کو ان سے روک لیا جاتا ہے اور قحط سالی کے ساتھ انہیں جکڑ لیا جاتا۔ (پکڑ لیا جاتا) اور وہ زکوٰۃ کو ادا کرنے سے نہیں رکتے مگر بارش کو ان سے روک دیا جاتا ہے۔

''الا'' کی پانچ صورتیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ان یقض القوم عهدا سلط الله علیهم عدوهم

(۲) ان یحکموا بغیر ما انزل الله فشا فیهم الفقر

(۳) ان بحيرت الفاحشة فيهم فشا فيهم الموت

(۴) ان يمنعوا الزكوٰة حبس عنهم القطر

﴿اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ﴾

(جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں) یعنی جب لوگوں سے اپنے حقوق کیل کرتے ہیں تو پورا پورا حق وصول کرتے ہیں۔

سوال: اکتیال کا صلہ من استعمال ہوتا ہے جبکہ یہاں 'علی " کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے اس صورت میں کیا حکمت عملی ہے؟

جواب اول: "علی "کو" من" کے ساتھ اس بات پر دلالت کرنے کے لئے بدلا گیا ہے کہ ان کا ناپ تول کر لینا اس حق کے لئے ہے جو لوگوں پر لازم ہوتا ہے۔

جواب دوم: یا ان کا کیل کرنا ایسا کیل کرنا ہے، جس سے لوگوں پر ظلم ہوتا ہے (جو لوگوں پر نقصان یعنی ظلم وستم کا متحمل ہے)

﴿وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ﴾

(اور جب لوگوں کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں) یعنی وہ لوگوں کے لئے کیل کرتے ہیں یا ان کے لئے وزن کرتے ہیں۔

﴿يُخْسِرُوْنَ﴾

(تو (ان کو) نقصان پہنچاتے ہیں)

سوال: متن قرآن میں تو کیل اور وزن کا صلہ لام مذکور نہیں لیکن آپ نے معنی میں صلہ کیوں ذکر کیا؟

جواب: حرف جر کو حذف کر دیا گیا ہے اور فعل کو ھم ضمیر کے ساتھ ملا دیا گیا ہے جیسے کسی شاعر کا قول ہے۔

تحقیق کہ میں نے آپ کے لئے عمدہ اور گھٹیا مشرو میں (کھمبیاں) اکٹھی کی۔

یہاں بھی اصل میں جنيت لك تھا یا عبارت كالوا مكيلهم تھی (یا ھم ضمیر سے پہلے "مکیل "کا لفظ محذوف ہے) پس مضاف کو حذف کر دیا گیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا۔

(بعض مفسرین کرام نے "كالوهم اووزنوهم "میں جمع کی ضمائر کو مؤکد اور ھم ضمیر کو تاکید بنا دیا ہے جو کہ درست نہیں علامہ بیضاوی اس بات کی جانب اشارہ فرما رہے ہیں)

ضمیر منفصل کو ضمیر متصل کے لئے تاکید بنانا اچھا نہیں ہے کیونکہ ضمیر منفصل کی تاکید بنانا کلام کو ماقبل کے مقابلہ سے خارج کر رہی ہے جبکہ مقصود لینے اور دینے کے معاملات میں ان کی حالت مختلف ہونے کو بیان کرنا ہے نہ کہ بذات خود تبادلہ کرنے یا کسی کے ذریعے تبادلہ کرنے میں۔

اور یہ ضمیر منفصل کو ضمیر متصل کے لئے تاکید بنانا واو کے بعد الف کو ثابت رکھنے کا تقاضہ کرتا ہے جیسا کہ مصحف عثمانی کا خط اس کی مثالوں میں سے ہے

(یعنی مصحف عثمانی میں واو جمع کی ضمیر کے بعد ضمیر مفعول آنے کے باوجود الف جمع کو حذف نہیں کیا گیا گویا وہاں عبارت یوں ہے۔"وا ذا كالوهم اووزنواهم"

﴿اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ﴾

(کیا وہ (اتنا) خیال بھی نہیں کرتے کہ انہیں قبروں سے اٹھایا جائے گا)

سوال: یہاں مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر ایمان کے لئے ظن کا لفظ کیوں ذکر کیا حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ افعال یقین میں سے کوئی فعل ذکر کیا جاتا ہے؟

جواب: بے شک جو مرنے کے بعد اٹھنے کا گمان بھی رکھتا ہے وہ اس قسم کے قبیح امور کو سرانجام دینے کی جسارت نہیں کرتا تو پس کیسے وہ شخص ان امور کو سرانجام دے گا جو مذکور کے بعد اٹھنے کا یقین رکھتا ہے اور اس میں ان کی تطفیف پر انکار اور ان کی حالت پر تعجب کا اظہار کرنا ہے۔

(انکار استفہام سے مستفاد ہے اور تعجب یقین کی جگہ ظن کے ذکر سے سمجھا جا رہا ہے)

﴿لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾ (ایک بڑے دن کے لیے)

سوال: روز قیامت کی صفت عظیم کس اعتبار سے ذکر فرمائی؟

جواب: اس دن کا عظیم ہونا اس دن میں واقع (رونما ہونے والی حالات واقعات) کے عظیم ہونے کی وجہ سے ہے۔

﴿یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ﴾

(جس دن لوگ (جوابدہی کے لیے) کھڑے ہونگے)

یوم کو مبعوثوں کے ساتھ نصب دی گئی ہے جار مجرور (لیوم عظیم) سے بدل ہے اور جر کے ساتھ پڑھا جانا اس کی تائید کرتا ہے

سوال: اگر اسے جار مجرور سے بدل بنایا جائے تو پھر یوم منصوب کیسے ہوگا؟

جواب: جب یوم کو فعل کی طرف مضاف کیا جائے تو اسے مبنی برفتحہ پڑھنا اور عامل کے مطابق اعراب دینا دونوں طرح جائز ہے جیسے

"ھذا یوم ینفع الصدقین صدقھم" (المائدۃ:۱۱۹) یہاں یوم کو پڑھنا بھی جائز ہے۔

(مزید تفصیلات کے لئے تسھیل النحو ۱۶۲)

﴿لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

(پروردگار عالم کے سامنے) اس کے حکم کے لئے (یعنی رب العالمین خود تو وہاں موجود نہیں ہوگا بلکہ اس کا حکم موجود ہوگا)

اور اس انکار میں، تعجب میں اور ظن کو ذکر کرنے میں اور الیوم کو صفت عظیم کے ساتھ متصف کرنے میں اور اس دن اللہ کے لئے لوگوں کے لئے قیام کرنے میں اور رب العالمین کے ساتھ تعبیر کرنے میں (ان تمام باتوں میں) لطفیف (ناپ تول میں کمی کرنے اور اس کے گناہ کو عظیم قرار دینے میں بہت سے مبالغات ہیں۔

﴿کَلَّآ﴾

(یہ حق ہے) یہ تطفیف (ناپ تول میں کمی) سے اور بعث وحساب سے غفلت برتنے سے جھڑکنا ہے۔

﴿اِنَّ کِتٰبَ الْفُجَّارِ﴾

(کہ بدکاروں کا نامہ عمل) جو ان کے اعمال لکھے جائیں گے یا ان کے اعمال کا لکھا جانا۔

"ما یکتب من اعمالھم" کی عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ کتاب بمعنی مکتوب (یعنی اسم مفعول کے معنی میں) ہے۔

"کتابہ اعمالھم" سے اس جانب اشارہ ہے کہ کتاب بمعنی کتابہ ہے۔(یعنی مصدر کے معنی میں ہے)

﴿لَفِیْ سِجِّیْنٍ﴾

(سجین میں ہوگا) ایسی کتاب جو جن وانس کے فجّار کے اعمالوں کو جامع ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

﴿وَمَآ اَدْرٰکَ مَا سِجِّیْنٌ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ﴾

(اور تمہیں کیا خبر کہ سجین کیا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی) یعنی ایسی کتاب جو کتابت کو واضح کرنے والی ہے یا ایسی معلوم/معروف/جانی گئی کتاب ہے کہ جس کو لکھنے والا جان لیتا ہے کہ اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

"سجین" یہ فعیل کے وزن پر ہے جو کہ السجن سے مشتق ہے۔

سوال: اس کتاب کو سجین کیوں کہا گیا؟

جواب اول: اس کتاب کے ساتھ کتاب کو سجین کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ فاجروں کو روکنے کا سبب بنے گی۔

جواب دوم: یا اس وجہ سے کہ وہ پھینک دی گئی ہے جیسا کہ کہا گیا کہ زمین کے نیچے ایک الگ/تنہا/مقام پر رکھی گئی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سجین اسم مکان ہے اس

صورت میں تقدیر کلام یوں ہوگا ما کتاب السجین محل کتاب مرقوم گویا مضاف کوحذف کر دیا گیا ہے۔(کتاب میں عبارت'' مکان السجین ''مذکور ہے اور حاشیہ شیخ زادہ میں بھی''مکان السجین '' ہے جبکہ حاشیہ شہاب''ما کتاب السجین '' ہے اور درست قول بھی حاشیہ شہاب والا ہے)

﴿وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ﴾

(تباہی ہوگی اس دن جھٹلانے والوں کے لیے)حق کو جھٹلانے والوں کے لئے یا اس دن کو جھٹلانے والوں کے لئے۔

﴿الَّذِیْنَ یُکَذِّبُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ﴾

(جو جھٹلاتے ہیں روز جزا کو) یہ المکذبین کی صفت مخصصہ ہے یا صفت موضحہ ہے یا صفت ذامہ ہے۔

اگر مکذبین سے مراد حق کو جھٹلانے والے ہوں گے تو یہ صفت مخصصہ ہوگی۔

اگر مکذبین سے مراد روز جزاء کو جھٹلانے والے ہوں گے تو یہ صفت موضحہ ہوگی۔

اگر مکذبین سے مراد روز قیامت کو جھٹلانے والے ہوں تو اس صورت میں اگر موصوف کی ذات من وجہ مجہول ہو تو یہ صفت موضحہ اور اگر موصوف کی ذات معلوم ہو تو یہ صفت ذامہ/ مذمت کرنے والی ہوگی۔

﴿وَمَا یُکَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا کُلُّ مُعْتَدٍ﴾

(اور نہیں جھٹلایا کرتے اسے مگر وہی جو حد سے گزرنے والا)غور فکر سے تجاوز کرنے والا اور بد عقیدہ آباؤ اجداد کی تقلید میں غلو کرنے والا یہاں تک کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اس کے علم کو محدود گمان کیا پس وہ دوبارہ زندہ کیے جانے کو محال سمجھتا ہے۔

﴿اَثِیْمٍ﴾

(گناہ گار(ہے)) ناقص شہوات میں منہمک ہونے والا ہے اس طرح کہ شہوات نے اسے اپنے علاوہ ہر دوسری اشیاء سے مشغول/ غافل کر دیا اور اپنے علاوہ دوسری اشیاء کے انکار پر برانگیختہ کیا۔

﴿اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ﴾

(جب پڑھی جاتی ہیں اس کے سامنے ہماری آیتیں تو کہتا ہے یہ پہلے لوگوں کے افسانے ہیں) جہالت کی زیادتی کی وجہ سے اور حق سے پہلوتہی /اعراض کرنے کی وجہ سے پس اسے نقلی دلائل کوئی فائدہ نہیں دیئے گے جیسا کہ اسے عقلی دلائل نے کوئی فائدہ نہ دیا

﴿کَلَّا﴾

(نہیں نہیں) یہ اس قول سے جھڑکنا ہے۔

﴿بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ﴾

(درحقیقت زنگ چڑھ گیا ہے ان کے دلوں پر ان کے کرتوتوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے)

جو باتیں ہو کیا کرتے تھے ان کو رد کرنا ہے اور اس چیز کو بیان کرنا ہے جو انہیں اس بات/قول کی طرف لے گئی کہ ان پر گناہوں کی محبت ان میں منہمک ہونے کی وجہ سے غالب آ گئی یہاں تک کہ گناہوں کی محبت ان کے دلوں پر زنگ بن گئی پس حق باطل کی معرفت ان پر مخفی ہوگئی افعال کی کثرت ملکات کے حصول کا سبب ہوتی ہے جیسا کہ آقادو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور''رین ''زنگ کو کہتے ہیں۔اور امام حفص نے لام کے اظہار کے ساتھ بل ران پڑھنا ہے۔اور امام حمزہ بن الذیات الکوفی ،اما م علی بن حمزہ الکسائی الکوفی اور امام ابو بکر عاصم بن بهدله الکوفی نے''بَل رَّیْنَ''پڑھا ہے

﴿کَلَّا﴾

(یقیناً)(یہ)''الرین''کے کسب سے جھڑکنا ہے۔

﴿اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾

(انہیں اپنے رب کے (کے دیدار) سے اس دن روک دیا جائے گا)

وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکیں گے بخلاف مومنین کے (یعنی قیامت کو جھٹلانے والے دیدار الٰہی سے محروم ہوں گے جبکہ مؤمنین کا معاملہ اس کے برعکس ہو گا) (امام بیضاوی معتزلہ کے عقیدہ کا رد فرما رہے ہیں معتزلہ کے آئمہ رؤیت باری تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں) اور جس شخص نے رؤیت کا انکار کیا ہے اس نے رؤیت کو تمثیل بنادیا ہے ان کو ذلیل اور رسوا کرنے کے لئے اس شخص کو ذلیل کرنے کے ساتھ جسے بادشاہوں کے دربار میں داخل ہونے سے روک دیا جاتا ہے۔

یا جس شخص نے رؤیت کا انکار کیا ہے اس نے مضاف کو مقدر مانا ہے یعنی انہیں رب کی رحمت یا رب کے قرب سے محروم کردیا جائے گا۔

﴿ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ﴾

(پھر وہ ضرور جہنم میں داخل ہوں گے) وہ آگ میں داخل ہوں گے اور آگ کو برداشت کریں گے۔

﴿ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ﴾

(پھر (ان سے) کہا جائے گا یہی وہ جہنم ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے)

(یہ بات ان سے کون کہے گا؟) جہنم کے فرشتے ان سے کہیں گے

﴿كَلَّا﴾

(یہ حق ہے) کلام کو پہلے کے لئے مکرر زکر کرنا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کے وعدہ شعور دلانے کے لئے ناپ تول میں کمی کرنا فجور ہے اور پورا پورا تولنا ماپنا نیکی ہے یا انہیں جھٹلانے سے روکنا ہے۔

﴿اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا عِلِّيُّوْنَ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ﴾

(نیکوکاروں کا صحیفہ عمل علیین میں ہوگا، اور تمہیں کیا خبر کہ علیین کیا ہے، یہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے (حفاظت کے لیے)) اس میں وہی جو کلام ہے جو اس کی مثال میں گزر چکا ہے۔

﴿يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾

(دیکھتے رہتے ہیں اسے مقربین) وہ اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں یا جو کچھ اس میں لکھا جاتا ہے اس پر قیامت کے دن گواہی دیں گے۔

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ﴾

(بے شک نیکوکار راحت و آرام میں ہوں گے پلنگوں پر بیٹھے) حجرہ عروسی میں پلنگوں/ چارپائیوں پر۔

﴿يَنْظُرُوْنَ﴾

((مناظر جنت کا) نظارہ کررہے ہوں گے) ان نعمتوں کی جانب جو انہیں نعمتوں میں سے اور ان جیسی دوسری اشیاء سے خوش کرتی ہے۔

﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ﴾

(آپ پہچان لیں گے ان کے چہروں پر راحتوں کی شگفتگی) نعمتوں کے حصول کی رونق اور ان کی چک دمک۔ (بریقہ)

اور یعقوب حضرمی بصری نے فعل مجہول کی بناء پر تعرف پڑھنا ہے اور ان نضرۃ کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔

﴿يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ﴾

(انہیں پلائی جائے گی سربمہر شراب) خالص شراب سے

﴿مَّخْتُوْمٍ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ﴾

(اس کی مہر کستوری کی ہوگی) یعنی مٹی کی جگہ ان کے برتنوں پر کستووی کی مہر لگی گی ہوگی اور شاید کے ان کی نفات کی مثال کرنا ہے۔یا وہ چیز جو اس کا اختتام ہو یعنی اس کی خوشبو کستوری اور کسائی تا کہ فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔یعنی جس کے ساتھ مہر لگائی جاتی ہے اور بند کر دیا جاتا ہے۔

﴿وَفِيْ ذٰلِكَ﴾

(اس میں (کیلئے)) ذلک کا مشار الیہ یا تو رحیق ہے یا نعیم ہے۔

﴿فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾

(سبقت لے جانے کی کوشش کریں سبقت لے جانے والے) رغبت رکھنے والوں کو رغبت لے جانی چاہے۔

﴿وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ﴾

(اس میں تسنیم کی آمیزش ہوگی) ایک چشمہ کا نام ہے،اور تسنیما کا نام دیا گیا ہے اس کے بلند جگہ پر واقع ہونے کی وجہ سے یا شراب کی قدر و قیمت کی وجہ سے۔

﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾

(یہ وہ چشمہ ہے جس سے صرف مقربین پئیں گے) پھر وہ اس خالص پئے گے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد کے علاوہ کسی دوسرے نام میں مشغول نہیں ہوئے تھے اور باقی اھل جنت والوں کے لئے اس میں آمیزش کی جائے گی۔

سوال: عینا منصوب کیوں ہے؟

جواب: **عینا** کو نصب دینا مدح کے طور پر یا تسنیم سے حال کے طور پر ہے جب **عینا** مدح کے طور پر منصوب ہوگا تو اس سے پہلے فعل محذوف نکلے گا اور جب تسنیم سے حال ہوگا تو اس وقت عینا مشتق کی تاویل میں ہوگا جیسے جاریۃ کا لفظ مغتق کی تاویل میں ہے۔

سوال: لیشوب کا صلہ ب ذکر کرنے میں کیا حکمت کارفرما ہے جبکہ یہ تو بغیر صلہ کے متعدی ہوتا ہے؟

جواب: اور ب میں کلام اسی طرح ہے جیسا کہ **لیشربون بھا عباد اللہ** میں ہے (یعنی یہ ب یا تو زائدہ برائے تاکید ہے یا یہ من کے معنی میں ہے اور من ابتدا کے لئے ہوگا کیونکہ پینے کی ابتدا اس چشمہ سے ہوگی)

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا﴾

(جو لوگ جرم کیا کرتے تھے) یعنی قریش کے سردار

﴿كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ﴾

(وہ اہل ایمان پر ہنسا کرتے تھے) وہ اھل ایمان کے فقراء سے استھزاء کیا کرتے تھے۔

﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ﴾

(اور جب ان کے قریب سے گزرتے تو آپس میں آنکھیں مارا کرتے) یعنی ایک دوسرے کے ساتھ آنکھ مارتے اور اپنی آنکھوں سے اشارہ کیا کرتے

﴿وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ﴾

(اور جب اپنے اہل خانہ کی طرف لوٹتے تو دل لگیاں کرتے واپس آتے) یعنی مؤمنین کے ساتھ تمسخر کر کے لطف اندوز ہوتے ہوئے واپس لوٹتے اور امام حفص نے فکھین پڑھنا ہے (جو کہ ہماری قرأت ہے جبکہ امام بیضاوی کی قرأت ''فاکھین'' ہے)

﴿وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ﴾

(اور جب وہ مسلمانوں کو دیکھتے تو کہتے تھے یقیناً یہ لوگ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں) جب کفار مؤمنین کو دیکھتے تو انہیں گمراہی کی جانب منسوب کرتے۔

﴿وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ﴾

(حالانکہ وہ اہل ایمان پر نہیں بھیجے گے تھے) (ھم ضمیر کا مرجع بتا رہے ہیں) مومنین پر

﴿حٰفِظِيْنَ﴾

(محافظ بنا کر تو) ان کے اعمال کی حفاظت کرتے اور ان کی گمراہی و ہدایت کی گواہی دیتے۔

﴿فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ﴾

(پس آج مومنین کفار پر ہنس رہے ہوں گے)

جب مومنین کفار کو انتہائی ذلیل اور آگ میں جکڑا ہوا دیکھے گے اور کہا گیا ہے کہ ان کے لئے جنت کی جانب/ جنت کا ایک دروازہ کھول دیا جائے گا پس کفار سے کہا جائے گا اس دروازہ کی جانب نکلو پس جب وہ اس دروازہ تک پہنچے گے تو ان کے آگے دروازہ بند ہو جائے گا اس وقت مومنین کفار پر ہنسیں گے۔

﴿عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ﴾

((عروسی) پلنگوں پر بیٹھے (کفار کی خستہ حالی کو) دیکھ رہے ہیں) یہ جملہ **یضحکون** سے حال واقع ہو رہا ہے۔

﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ﴾

(کیوں کچھ بدلہ ملا کفار کو) کیا کفار کو بدلہ دے دیا گیا۔

﴿مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾

((اپنے کرتوتوں کا) جو وہ کیا کرتے تھے)

امام حمزہ بن الذیات الکوفی اور امام علی بن حمزہ الکسائی الکوفی نے لام کو ث میں ادغام کرنے کے ساتھ پڑھا ہے۔

"اللھم اغفرلی و اجعل حیاتی ھدی للناس"

سورۃ نمبر 07	سورہ الانشقاق	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	کل آیات 25

﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ﴾

((یاد کرو) جب آسمان پھٹ جائے گا) بادلوں کے ذریعے سے

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ آسمان بادلوں کے ذریعے پھٹ جائے گا۔

(یہاں "ب" آلہ کے لئے ہے) علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے انشقت کی تفسیر بالضمام کے ساتھ اس لئے کی ہے کہ قرآن کا بعض حصہ بعض حصہ کی تفسیر بیان کرتا ہے۔ (**القرآن یفسر بعضہ بعضا**) اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول سے مروی ہے کہ آسمان کے چھٹنے کی ابتداء کہکشاں سے ہوگی۔

﴿وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا﴾

(اور کان لگا کر سنے گا اپنے رب کا فرمان)

اسے غور سے سنے گا یعنی جب اللہ تعالیٰ آسمان کے چھٹنے کا ارادہ فرمائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی تاثیر کی وجہ سے پیری کرے اس پیروی کرنے والے کی طرح جو (حکم کو غور سے سنتا ہے اور اسے سرانجام دیتا ہے) اس حکم کی تعمیل کرتا ہے۔

﴿وَحُقَّتْ﴾

(اور اس پر فرض بھی یہی ہے) اسے غور سے سننے اور اطاعت کرنے کا حق دار بنا دیا گیا ہے کہا جاتا ہے

"فھو محقوق و حقیق"

فلاں کو حق دار بنا دیا گیا ہے پس اس کو یہی زیبا ہے اور اس کی شان کے لائق ہے۔

(مطلب یہ ہے کہ اہل عرب اس معنی کو بیان کرنے کے لئے فعل مجہول استعمال کرتے ہیں)

﴿وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ﴾

(اور جب زمین پھیلا دی جائے گی) یعنی جب زمین کو اس کے پہاڑوں اور ٹیلوں کو ختم (زائل) کرنے کے ساتھ بچھا دیا جائے گا۔

﴿وَاَلْقَتْ مَا فِیْهَا﴾

(اور باہر پھینک دے گی جو کچھ اس کے اندر ہے) یعنی جو خزانے اور مردے اس کے پیٹ میں ہیں۔ (سب کو باہر نکال دے گی)

﴿وَتَخَلَّتْ﴾

(اور خالی ہو جائے گی) خالی ہونے میں انتہاء درجہ کا تکلف کرے گی یہاں تک کہ اس کے اندر کوئی چیز بھی باقی نہیں رہے گی۔

﴿وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا﴾

(اور کان لگا کر سنے گا اپنے رب کا فرمان) پھینکنے میں اور خالی کرنے میں۔

﴿وَحُقَّتْ﴾

(اور اس پر فرض بھی یہی ہے) غور سے سننے کے لئے۔

سوال: اذا کو مکرر لانے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

جواب: اذا کو دوبارہ ذکر کرنا اس وجہ سے ہے کہ دونوں جملے (اذا السماء انشقت اور اذا لارض مدت) قدرت کی نوع میں مستقل ہیں۔ (یعنی دونوں جملے اللہ تعالیٰ کی الگ الگ قدرتوں پر مشتمل طور پر دلالت کرتے ہیں)

سوال: جب شرط پائی جائے تو جزاء کا پایا جانا ضروری ہے یہاں جواب شرط کہاں ہے؟

جواب: اذا کا جواب حذف کر دیا گیا ہے۔

(۱) ابہام کے ساتھ ہولناکی پیدا کرنے کے لئے۔

(۲) جو حالات دو سورتوں (سورۃ تکویر اور سورۃ انفطار) میں گزر چکے ہیں انہیں پر اکتفاء کرتے ہوئے۔ (یعنی جو وہاں جواب تھا یہاں بھی وہی جواب ہے)

سوال: سورۃ تکویر و انفطار میں کونسی چیز گزر چکی ہے جن پر اکتفاء کیا گیا ہے؟

جواب: جب زمین و آسمان پھٹ جائیں گے قیامت کی اور باقی نشانیاں ظاہر ہو جائیں گی تو ''**علمت نفس ما قدمت و اخرت**'' یعنی ہر شخص جان لے گا جو کچھ اس نے آگے بھیجا ہوگا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کا جزاء پر دلالت کرنے کی وجہ سے (ان تین صورتوں کی وجہ سے جزاء کو حذف کیا گیا ہے)

﴿یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ﴾

(اے انسان! تو محنت سے کوشاں رہتا ہے اپنے رب کے پاس پہنچنے تک پس تیری اس سے ملاقات ہو کر رہتی ہے)

سوال: "**یا ایھا الانسان انك كادح الى ربك كدحا فملقيه**" یہ جملہ انشائیہ ہے اور جب جملہ انشائیہ جزاء بن رہا ہو تو اس پر ف کا آنا لازم ہے جبکہ یہاں تو ''ف'' موجود نہیں؟

جواب: یہ جملہ جزاء نہیں بن رہا بلکہ جزاء پر دلالت کر رہا ہے تقدیر کلام یوں ہے "**لاقی الانسان کدحه**"

ترجمہ: یہ ہوگا کہ انسان ایسی تھکا دینے والی کوشش سے دوچار ہوگا جو اس میں اثر کرے گی اور یہ عربوں کے قول کدحہ سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی چیز ایسا پنچ مارے جس کے نشان باقی رہیں یا پھر اذا کا جواب **فھو ملقیه** ہے اور **یا ایھا الانسان کادح الی ربك** یہ جملہ معترضہ ہے اور **الکدح الی** کا معنی یہ ہے کہ انسان کو اپنی جزاء پانے کی کوشش کرنا۔

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا﴾

(پس جس کو دیا گیا اس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں تو اس سے حساب آسانی سے لیا جائے گا)

یعنی ایسا انسان جس میں کوئی چھان بین (سوال و جواب اعتراضات) نہیں ہوں گے۔

﴿وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾

(اور وہ واپس لوٹے گا اپنے گھر والوں کی طرف شاداں وفرماں)

اہل سے کیا مراد ہے؟

اس کے بارے میں تین احتمالات ہیں

(۱) اس کے قبیلے رشتہ دار مومن افراد ہیں۔

(۲) مومنین کا گروہ

(۳) جنت میں جو اس کے اہل ہوں گے یعنی حوریں

نوٹ: اہل کا لفظ کبھی قریبی رشتہ داروں کے لئے بولا جاتا ہے جیسا کہ پہلے معنی میں ہے کبھی مطلقا قوم کے لئے بولا جاتا ہے جیسا کہ دوسرے معنی میں ہے اور کبھی بیوی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ تیسرے معنی میں ہے۔

﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ﴾

(اور جس (بدنصیب کو) اس کا نامہ عمل پس پشت دیا گیا)

یعنی اس کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا دائیں ہاتھ کو گردن کے پیچھے باندھ دے جائے گا اور بایاں ہاتھ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے کر دیا جائے گا۔

﴿فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا﴾

(تو چلائے گا ہائے موت! ہائے موت!)

یعنی موت کی تمنا کرے گا اور چلائے گا یائے ہلاکت اور ثبور سے مراد ہلاکت ہے۔

﴿وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا﴾

(اور داخل ہوگا بھڑکتی آگ میں)

اور ابن کثیر مکی اور نافع مدنی ابن عامر شامی اور کسائی نے اس کو باب تفعیل سے یصلی پڑھا ہے۔

سوال: کیا کہیں اور بھی یہ فعل باب تفعیل سے آیا ہے؟

جواب: جی ہاں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

"و تصلية جحيم"

اس آیت میں باب باب تفعیل کا مصدر آیا ہے اور اسے باب افعال سے یصلی بھی پڑھا گیا ہے۔

سوال: کیا کسی دوسری جگہ بھی باب افعال سے آیا ہے؟

جواب: جی ہاں جیسا کہ قرآن میں ہے

"و نصليه جهنم"

(یہ باب افعال سے فعل مضارع ہے)

﴿اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ﴾

(بے شک وہ (دنیا میں) اپنے اہل و عیال میں) دنیا میں

﴿مَسْرُوْرًا﴾

(خوش وخرم رہا کرتا تھا) مال وجاہ کے ساتھ تکبر کرتا تھا اور آخرت سے لاتعلق رہا کرتا تھا۔

﴿اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ﴾

(وہ خیال کرتا تھا کہ وہ (اللہ کے حضور) لوٹ کر نہیں جائے گا) وہ کبھی بھی (اللہ کے حضور) لوٹ کر نہیں جائے گا

﴿بَلٰى﴾

(کیوں نہیں) یہ مذکورہ "اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ" کا جواب ہے (یعنی کیوں نہیں وہ ضرور زندہ کیا جائے گا اور اللہ کی طرف لوٹے گا)

﴿اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا﴾

(اس کا رب اسے خوب دیکھ رہا تھا)

اس کے اعمال کو جاننے والا ہے پس وہ اسے مہمل نہیں چھوڑے گا بلکہ اس کو لوٹائے گا (زندہ کرے گا اور جزاء دے گا)

﴿فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ﴾

(پس میں قسم کھاتا ہوں شفق کی) ایسی سرخی جو غروب آفتاب کے بعد مغرب کے افق میں دیکھی جاتی ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد ایسی سفیدی ہے جو سرخی کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔

سوال: اس سرخ یا سفیدی کو شفق کیوں کہا گیا ہے؟

جواب: چونکہ وہ سفیدی یا سرخی ہلکی ہلکی ہوتی ہے اس لئے اس کے ہلکا ہونے کی وجہ سے اس کو شفق کا نام دیا گیا ہے اور یہ شفقۃ سے ماخوذ ہے۔

﴿وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ﴾

(اور رات کی اور جن کو وہ سمیٹے ہوئے ہیں)

اور جو وہ جمع کیے ہوئے ہیں اور چھپائے ہوئے ہیں جانوروں میں سے اور ان کے علاوہ (وسق جمع کرنے اور چھپانے کے معنی میں ہے کیونکہ جب رات آتی ہے تو ہر چیز کو اپنی پناہ گاہ میں لے لیتی ہے اس طرح رات کی تاریکی گویا پہاڑوں سمندروں، درختوں اور جانوروں کو ڈھانپ لیتی ہے۔

سوال: کیا وسق جمع کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے؟

جواب: جی ہاں جیسا کہ کہا جاتا ہے وسقہ اس نے اسکو جمع کیا فاتسق پس وہ جمع ہو گیا اور استوسق کا معنی بھی جمع ہونا ہے۔

کسی شاعر نے کہا کہ

ان لنا قلائنسا و حقائقا

مستو سقات لو ليجدن سائقا!

ہمارے لئے یعنی وہ کتنی جمع ہونے والی ہیں اگر وہ ہانکنے والا پالیتی تو وہ ان کو ہانک کر لے جاتا یا وسق بمعنی طرد ہے اس صورت میں معنی ہوگا قسم ہے رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ اپنے اماکن کی طرف بھگا دے اس صورت میں یہ وسقۃ سے ماخوذ ہوگا۔

(وسیقۃ چوری ہونے والے اونٹوں کو کہا جاتا ہے کیونکہ چور ان کو ان کے اماکن سے دور بھگا کر لے جاتا ہے)

﴿وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ﴾

(اور چاند کی جب وہ ماہ کامل بن جائے) یعنی جب وہ جمع ہو جائے اور بدر کامل بن جائے۔

﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾

(تمہیں (بتدریج) زینہ بہ زینہ چڑھنا ہے) تمہیں ضرور ایک حالت سے دوسری ایسی حالت کی طرف چڑھنا ہے جو شدت میں ماقبل حالت کے مطابق

ہوگی۔اور طبق ایسی چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیز کے مطابق ہوگی اور کہا گیا ہے کہ طبق ایسی حالت کو کہتے ہیں جو دوسرے کے مطابق ہو یا تم شدت کے مراتب کے بعد دوسرے مراتب پر چڑھو گے اور وہ مراتب موت' قیامت کے مراحل اور اس کی ہولناکیاں ہیں یا مراتب سے مراد موت اور اس سے پہلے جو بڑے بڑے مصائب ہیں وہ مراد ہیں اس صورت میں یہ طبقۃ کی جمع ہوگی۔

امام ابن کثیر مکی' امام حمزہ بن الذیات کوفی کوفی اور امام علی بن حمزہ الکسائی الکوفی اس صورت میں خطاب انسان کو باعتبار لفظ ہوگا یا رسول اللہ ﷺ کو ہوگا (نبی ﷺ کو خطاب کی صورت میں معنی ہوگا (کہ آپ ﷺ ایک حالت شریفہ اور مرتبہ عالیہ کے بعد دوسرے حالت شریفہ اور مرتبہ عالیہ پر ضرور فائز ہوں گے یا معراج کی رات کو ایک طبق کے بعد آسمان کے دوسرے طبق پر جلوہ گر ہوں گے (چڑھیں گے)

اسے کسرہ کے ساتھ لتر کبن بھی پڑھا گیا ہے (اس صورت میں یہ واحد مونث مخاطب کا صیغہ ہوگا اور خطاب نفس کو ہوگا) اور اس کو غیب کے صیغہ پر یاء کے ساتھ لیر کبن بھی پڑھا گیا ہے۔

اور (عن طبق) جار مجرور یا تو طبقا کی صفت ہوگی یا لتر کبن میں ضمیر فاعل سے حال ہوگا۔

اگر لیر کبن واحد کا صیغہ ہو تو (عن طبق) جار مجرور "مجازا" شبہ فعل کے متعلق ہوگا حال بنے گا اور معنی یہ ہوگا فمجاوزا لطبق۔

اگر لیر کبن جمع کا صیغہ ہو کر حال بنے گا اور معنی یہ ہوگا مجاوز بن لطبق (یعنی تم ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ کی طرف تجاوز کرتے ہوئے چڑھو گے۔

﴿فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾

(پس انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے) پس وہ قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے۔

﴿وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ (آیت سجدہ)﴾

(اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے)

لایسجدون کے بارے میں دو احتمال ہیں:

(۱) لَا يَسْجُدُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ وہ خشوع و خضوع نہیں کرتے۔

(۲) لَا يَسْجُدُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ وہ قرآن کی تلاوت کے لئے سجدہ نہیں کرتے۔(یعنی جب آیت سجدہ تلاوت کی جائے تو سجدہ نہیں کرتے)

(واسجدو اقترب)

آپ ﷺ نے اور جو مؤمنین آپ ﷺ کے ساتھ تھے پس تب یہ آیت نازل ہوئی اور اس آیت سے امام اعظم ابوحنیفہ نے سجدہ تلاوت کے وجوب پر دلیل پکڑی ہے اس شخص کی مذمت کی جارہی ہے جو آیت سجدہ کو سنے اور سجدہ نہ کرے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روات کیا گیا ہے کہ (حضرت ابو ھریرہ) نے اس آیت پر سجدہ کیا اور صحابی رسول ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی قسم! میں اس آیت پر سجدہ نہیں کیا کرتا تھا میں نے رسول ﷺ کو دیکھنے کے بعد کہ وہ سجدہ کرتے ہیں۔

﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ﴾

(بلکہ یہ کفار اس (الٹا) جھٹلاتے ہیں) یعنی قرآن کو (جھٹلاتے ہیں)

﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ﴾

(اور اللہ خوب جانتا ہے جو اُن (کے دلوں) میں بھرا ہوا ہے) یعنی جو وہ اپنے سینوں میں کفر و عداوت کو پوشیدہ کئے ہوئے ہیں۔

﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾

(پس آپ انہیں خوشخبری دردناک عذاب کی) بشارت کا لفظ عام طور پر خوشخبری اچھی خبر دینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہاں) استہزاء کے طور پر استعمال ہوا ہے (یعنی ان سے استہزاء کرتے ہوئے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنائیں)

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾

(البتہ جولوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے) استثناء منقطع ہے (اس صورت میں فبشرھم میں ھم ضمیر کا مصداق الذین اٰمنوا سے مختلف ہے یعنی کفار اور مؤمنین الگ الگ قومیں ہیں) یا یہ استثناء متصل ہے (اس صورت میں الذین اٰمنوا کا مصداق ھم ضمیر کا بعض ہی ہے) اور مراد یہ ہے کہ ان کفار میں سے ہی جولوگ توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں۔

﴿لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾

(ان کے لیے ایسا اجر ہے جو منقطع نہ ہوگا)

ممنون کے دو معنی بیان کیے ہیں:

(۱) مقطوع: یعنی ایسا اجر جو ختم نہیں ہوگا۔

(۲) ممنون به علیهم: یعنی ایسا اجر جس کی وجہ سے ان پر احسان نہیں جتلایا جائے گا۔

اللهم اجعل حیاتی لناس هدی واعظ مغفرة (امین)

سورۃ نمبر 08	سورہ البروج	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	کل آیات 22

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ﴾

(قسم ہے آسمان کی جو برجوں والا ہے)

سوال: بروج سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس کے متعلق چار احتمالات ہیں

(۱) اس سے بارہ برج مراد ہیں۔

سوال: عام طور پر برج تو عمارت کے اوپر بنائے جاتے ہیں تو آسمان کو محلات کے ساتھ تشبیہ دینے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: آسمان کو محلات کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ اس میں سیارات نازل ہوتے ہیں اور کچھ برجوں میں مستقل طور پر موجود رہتے ہیں۔

(۲) چاند کی منازل مراد ہیں۔

(۳) بروج سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں ان کو بروج کا نام ان کے (دور سے) ظاہر ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے۔

(۴) بروج سے مراد آسمان کے دروازے ہیں کیونکہ مصائب (مصیبتیں) رحمتیں وغیرہ (نازل ہونے والی اشیاء) انہیں سے نکلتی ہیں اور ب، ر، ج کی اصل ترکیب ظاہر ہونے کا معنی دینے کے لئے ہے۔

﴿وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ﴾

(اور اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے) اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔

﴿وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ﴾

(اور حاضر ہونے والے دن کی اور اس کے پاس جس کے پاس حاضر ہوں گے) شاہد کے دو معنی ہیں

(۱) حاضر ہونے والا۔

(۲) گواہی دینے والا۔

المعنی الاول " ومن یشهد فی ذالك الیوم من الخلائق "

شاہد سے مراد جو مخلوقات اس دن حاضر ہونگیں اور مشہود سے مراد جو عجائب اس دن حاضر کیے جائیں گے۔

سوال: شاہد اور مشہود کو نکرہ ذکر کرنے میں کیا حکمت کارفرما ہے؟

جواب: ان کے وصف میں ابہام پیدا کرنے کے لئے ان کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے یعنی وہ ایسے شاہد و مشہود ہیں کہ ان کی حقیقت کا ادراک نہیں کیا جاسکتا یا (شاہد و مشہود) کی کثرت میں مبالغہ کے لئے ان کو نکرہ ذکر فرمایا گویا کہ کہا گیا ہے کہ شاہد و مشہود کی کثرت کتنی ہی زیادہ ہوگئی۔

المعنی الثانی "او النبیّ علیہ السلام "

یا نبی ﷺ شاہد اور آ ﷺ کی امت مشہود ہے یا امت محمدیہ شاہد اور بقیہ امتیں مشہود ہیں یا ہر نبی ﷺ اور اس کی امت مشہود ہے یا خالق (اللہ تعالیٰ) شاہد اور مخلوق مشہود ہے یا اس کے برعکس ہے (یعنی مخلوق کی تخلیق پر آگاہ ہے۔

سوال: خالق شاہد اور مخلوق مشہود کس طرح ہے؟

جواب: مخلوق اللہ تعالیٰ کے وجود پر گواہی دینے والی ہے۔

یا شاہد سے مراد محافظ فرشتے اور مشہود سے مراد مکلف مراد ہے (یعنی محافظ فرشتے یعنی کراما کاتبین اور مکلف سے مراد جن وانس ہیں) یا شاہد سے مراد یوم نحر یا یوم عرفہ کا دن اور مشہود سے مراد حجاج ہیں یا شاہد سے مراد جمعہ کا دن ہے اور مشہود سے مراد جمعہ کی ادائیگی کے لئے جمع ہونے والے لوگ مراد ہیں یا شاہد سے مراد ہفتہ کا ہر دن ہے اور مشہود سے مراد اس دن کے مکین ہیں۔

﴿شاہد و مشہود کے بارے میں کل دس اقوال (احتمالات) ہیں﴾

قول	شاہد	مشہود
(۱)	قیامت کے دن حاضر ہونے والے	قیامت کے دن ظاہر کیے جانے والے عجائبات
(۲)	نبی کریم ﷺ	امت محمدیہ
(۳)	امت محمدیہ ﷺ	باقی انبیاء کی امتیں
(۴)	ہر نبی ﷺ	اور اس کی امت
(۵)	خالق	مخلوق
(۶)	مخلوق	خالق
(۷)	کراما کاتبین	مکلف (جن وانس)
(۸)	یوم نحر یا یوم عرفہ	حج کرنے والے
(۹)	جمعہ کا دن	جمعہ ادا کرنے کا دن
(۱۰)	ہر دن	اس دن کے مکین

کیونکہ جمع کا دن ان کے بارے میں گواہی دے گا۔

﴿قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ﴾

(مارے گئی کھائی کھودنے والے) کہا گیا ہے کہ یہ جواب قسم ہے۔

سوال: آپ بخوبی جانتے ہیں کہ جب جملہ فعلیہ جواب قسم بن رہا ہو اور اس کا یہاں پر قتل سے پہلے لقد کو ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟

جواب: اس کو جواب قسم ماننے کی صورت میں لقد کو محذوف ماننا جائے گا اور تقدیر کلام یوں ہوگا" لقد قتل "

اور سب سے زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ قتل اصحاب الاخدود جواب قسم محذوف کی دلیل ہے گویا کہ کہا گیا ہے کہ وہ ملعون ہیں یعنی کفار مکہ ملعون ہیں جس طرح

اصحاب اخدود کوملعون (مردود) کر دیا گیا۔

یہ سورۃ مومنین کو ان کی تکالیف پر ثابت قدم رکھنے کے لئے نازل ہوئی ہے اور وہ تکلیفیں یاد دلانے کے لئے نازل ہوئی جو ان سے پہلے لوگوں پر جاری ہوئی تھیں الاخدود، خد کو کہتے ہیں اور خد کا معنی ہے زمین گڑھا کھودنا (یعنی ''الاخدود'' ہو یا ''الاخد'' دونوں کا معنی زمین میں گڑھا کھودنا ہے) ان دونوں کی مثال باعتبار لفظ و معنی الخفق اور الاخقوق ہے۔

"نَحوُهُمَا بناءً ومعنىً الخَفقُ و الا خَقُوقُ "

سوال: اصحاب اخدود کون لوگ تھے؟

جواب اوّل:

روایت کیا گیا ہے کہ ایک بادشاہ کے ہاں ایک جادوگر تھا جب جادوگر عمر رسیدہ ہوگیا تو اس نے ایک لڑکے کو اپنے ساتھ ملا لیا تاکہ وہ اس کو جادو سکھائے لڑکے کے راستے میں ایک راہب (رہائش پذیر) تھا لڑکے کا دل اس راہب کی طرف مائل ہوگیا لڑکے نے ایک دن اپنے راستے میں ایک سانپ دیکھا جو لوگوں (کے راستے کو) روکے ہوئے تھا لڑکے نے ایک پتھر اٹھایا اور کہا اے اللہ اگر یہ راہب تجھے جادوگر سے زیادہ پسندیدہ ہے تو سانپ کو قتل (ہلاک) کردے پس لڑکے نے سانپ کر پتھر مارا سانپ ہلاک ہوگیا،

ف فصیحیہ ہے جو کہ شرط کے حذف پر دلالت کر رہی ہے محذوف عبارت یوں ہوگی "رقى الغلام الحجر الى حية فقتلها "

لڑکے نے اس کے بعد مادر زاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو درست کرنے لگا

بعد کا مضاف الیہ ھذا محذوف ہے تقدیر کلام ''بعد ھذا'' ہے۔ اور بیماریوں سے نجات (شفاء) دینے لگا اور بادشاہ کا مصاحب اندھا ہوگیا لڑکے نے اسے صحت یاب کر دیا بادشاہ نے اپنے (مصاحب) سے سوال کیا کہ کس نے شفایاب (درست کیا) تو اس نے کہا میرے رب نے بادشاہ غضب ناک ہوگیا اور اس پر سختیاں شروع کر دی اس نے بادشاہ کی لڑکے کی طرف راہ نمائی کی بادشاہ نے لڑکے پر سختیاں شروع کر دی پس لڑکے نے راہب کی طرف راہ نمائی کی بادشاہ نے راہب کو آرے کے ساتھ چیر دیا اور لڑکے کو پہاڑی کی طرف بھیجا تاکہ پہاڑ کی چوٹی سے اسے گرا دیا جائے لڑکے نے دعا کی تو پہاڑ تھرتھرانے لگا بادشاہ کے بھیجے ہوئے سپاہی ہلاک ہوگئے اور لڑکا بچ گیا بادشاہ نے اسے کشتی میں سوار کروایا تاکہ اسے غرق کر دیا جائے لڑکے نے دعا کی پس کشتی اپنے سواروں کے ساتھ الٹ گئی سپاہی ہلاک ہوگئے لڑکا بچ گیا لڑکے نے بادشاہ سے کہا تم مجھے قتل نہیں کر سکتے یہاں تک کہ تم لوگوں کو اکٹھا کرو اور مجھے سولی پر لٹکاؤ اور میرے ترکش سے ایک پکڑو اور کہو اللہ کے نام سے جو اس لڑکے کا رب ہے پھر مجھے مارنا پس بادشاہ نے اسے تیر مارا تیرا کنپٹی میں لگا لڑکا واصل بحق (شہید) ہوگیا (یہ دیکھ کر) تمام لوگ لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے بادشاہ نے خندقیں کھودنے کا حکم صادر کیا اور اس میں آگ جلائی گئی جو (دین حق سے لوٹ آنے کا) انکار کرتا اس خندق میں پھینک دیتا یہاں تک کہ ایک عورت آئی جس کے ساتھ ایک بچہ تھا وہ ذرا جھجکی (گھبرائی) بچہ نے کہا اے ماں! آپ صبر کریں بے شک آپ حق پر ثابت ہیں پس عورت بھی آگ میں داخل ہوگئی۔

دوسرا جواب:

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ ایک مجوسی بادشاہ نے لوگوں سے خطاب کیا اور کہا! اللہ نے بہنوں کے ساتھ نکاح کو حلال (جائز) قرار دیا ہے لوگوں نے اس کی بات کو قبول نہ کیا پس مجوسی بادشاہ نے آگ کی خندقیں کھودنے کا حکم صادر کیا جو (دین حق سے لوٹ آنے کا) انکار کرتا اسے خندق میں گرا دیتا۔

تیسرا جواب:

کہا گیا ہے کہ جب اھل نجران عیائی ہوگئے تو ذنو اس یہودی نے جو قبیلہ حمیر سے تعلق رکھتا تھا (اس نے) ان کو اذیتیں دیں اور جو لوگ عیسائیت سے مرتد نہ ہوئے ان کو خندقوں میں جلا دیا جائے گا۔

﴿النَّارِ﴾ (آگ) یہ الاخدود سے بدل اشتمال ہے۔

﴿ذَاتِ الْوَقُوْدِ﴾

(بڑے ایندھن والی)

یہ النار کے لئے صفت ہے جو آگ کے عظیم ہونے اور اس چیز کے کثیر ہونے کی وجہ سے لائی گئی ہے جس کے ساتھ آگ کے شعلے بلند ہوتے ہیں اور الوقود پر الف لام جنس کے لئے آیا ہے۔

﴿اِذْهُمْ عَلَیْهَا﴾

(جب وہ اس (کے کنارے) پر)

یعنی آگ کے کنارے پر (مطلب آگ پر تو نہیں بیٹھے ہوں گے بلکہ جس گھڑے (کھائی) میں آگ جل رہی ہوگی اس کے کنارے پر ہونگے)

﴿قُعُوْد﴾

(بیٹھے (تھے)) (قعود) قعود بمعنی قاعدون ہے۔

﴿وَّهُمْ عَلٰی مَا یَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ شُهُوْدٌ﴾

(اور جو کچھ اہل ایمان کے ساتھ سلوک کررہے تھے اس دیکھ رہے تھے)

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ تعالی علیہ شہود کا معنی گواہ کررہے ہیں) یعنی وہ بادشاہ کے پاس ایک دوسرے کے بارے میں گواہی دے رہے تھے کہ انہیں دیئے جانے والے حکم میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی یا قیامت کے دن وہ ان کاموں کی گواہی دے گے جو وہ کیا کرتے تھے اس لئے کہ اس وقت ان کے ہاتھ اور ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔

﴿وَمَا نَقَمُوْا﴾

(اور انہیں ناپسند کیا تھا) اور انہوں نے انکار نہیں کیا۔

﴿مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ﴾

(انہوں نے مسلمانوں سے بجز اس کی کہ وہ ایمان لائے تھے اللہ پر جو سب پر غالب، سب خوبیوں سراہا ہے)

یہ کسی شاعر کے قول کی مثل استثناء ہے۔

ولا وعیت فیهم غیر ان سیو فهم

بهن فلول من قرع الکتاب

ان میں کوئی عیب نہیں سوائے یہ کہ تلواریں لشکروں کے ملنے کے وقت خراب ہو جاتی ہیں (دندانے پڑھ جاتے ہیں)

اللہ تعالی نے صفت عزیز ذکر فرمائی کہ وہ غالب ہے اس عذاب سے ڈر جائے اور صفت حمید ذکر فرمائی کہ وہ انعام کرنے والا ہے اسی سے ثواب کی امید کی جائے اور اپنے اس اشارہ کو اس ارشاد سے ملایا

﴿الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ﴾

(جس کے قبضہ میں آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی ہے اور اللہ تعالی ہر چیز کو دیکھنے والا ہے)

اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ وہی ذات اس بات کی مستحق ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور اسی کی ہی عبادت کی جائے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾

(بے شک جن لوگوں نے ایذا دی مومن مردوں اور مومن عورتوں کو) انہیں تکالیف کے ساتھ آزمائیں۔

﴿ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ﴾

(پھر توبہ بھی نہیں کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے) ان کے کفر کے سبب۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِیْقِ﴾

(اور ان کے لیے جائے جانے کا عذاب ہے) ان کے فتنہ وفساد کی وجہ سے ایسا عذاب ہوگا جو جلائے جلانے سے بھی بڑھ کر ہوگا اور کہا گیا ہے کہ "الذین فتنوا " سے مراد خاص اصحاب اخدود مراد ہیں اور عذاب حریق وہی عذاب ہے جو روایت کہا گیا کہ آگ ان پر الٹ گئی پس اس نے انہیں جلا دیا اصحاب اخدود مؤمنین کو آگ میں پھینک رہے تھے کہ خندق کی آگ ان پر برس پڑی کسی کی آندھی کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے پس وہ لوگ اپنی ہی جلائی جانے والی آگ میں جل گئے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِیْرُ﴾

(جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں یہی بڑی کامیابی ہے) کیونکہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ اس کامیابی کے مقابلے میں حقیر ہے۔

﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ﴾

(بے شک آپ کے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے) اس کا سختی سے پکڑنا کئی گناہ بڑھ کر ہے اس لئے بطش کا معنی سختی سے پکڑنا ہے۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَیُعِیْدُ﴾

(بے شک وہی پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا)

اگر یبدی کا مفعول "الخلق" محذوف ہو تو معنی ہوگا وہی ذات ہے جس نے پہلی مرتبہ پیدا فرمایا اور دوسری مرتبہ بھی پیدا فرمائے گا"

اگر یبدی کا مفعول "البطش" محذوف ہو تو معنی ہوگا وہی ذات ہے جس نے دنیا میں کافروں کو سختی کے ساتھ پکڑا اور آخرت میں بھی پکڑ فرمائے گا۔

﴿وَهُوَ الْغَفُوْرُ﴾ (اور وہی بہت بخشنے والا) اس شخص کو جو توبہ کرتا ہے۔

﴿الْوَدُوْدُ﴾

(بہت محبت کرنے والا ہے) بہت زیادہ محبت کرنے والا ہے جو اس کی اطاعت کرے۔

﴿الْمَجِیْدُ﴾

(بڑی شان والا) یعنی عرش کو پیدا فرمانے والا ہے (خالقہ) اور کہا گیا ہے کہ عرش سے مراد بادشاہی ہے اور اسے ذی العرش بھی پڑھا گیا ہے (اس صورت) "ربك " کی صفت ہوگی۔

﴿ذُو الْعَرْشِ﴾

(عرش کا مالک ہے) اپنی ذات اور صفات میں بہت عظمت والا ہے اس لئے کہ واجب الوجود (ممکن الوجود) قدرت وحکمت والا ہے (ہمارے وجود کا ہوا یا نہ ہونا یکساں ہے اگر ہم دنیا میں نہ بھی جنم لیتے تو اس دنیا کی رونقوں میں کوئی کمی یا اضافہ نہیں ہونا تھا لیکن اللہ کی ذات نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا) اور حمزہ اور کسائی نے اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے (اس صورت میں) یہ "ربك "یا العرش کی صفت ہوگی اور عرش کی بلندی اس کی اس کی عظمت وشان کے اعتبار سے ہے۔

﴿فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ﴾

(کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے) اللہ تعالیٰ کے اپنے امر اور اس کے بندوں کے عمل میں سے جو بھی اس کی مراد ہو اس کو روکا نہیں جاسکتا۔

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ، فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ﴾

(کیا پہنچی آپ کے پاس لشکروں کی خبر (یعنی) فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی) فرعون وثمود دونوں الجنود سے بدل نہیں۔

سوال: جنود جمع ہے اور فرعون مفرد ہے پھر کیسے درست ہوگا؟

جواب: کیونکہ فرعون اور اس کی قوم ہے اور معنی یہ ہوگا کہ آپ نے ان اقوام کا اپنے رسولوں کو جھٹلانے کے عمل کو اور جو ان کو عذاب پہنچا اس کو تکذیب پر صبر فرمائے اور انہیں اس طرح کے عذاب سے ڈرائیں جو ان اقوام کو پہنچا۔

﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ﴾

(بلکہ یہ کفار جھٹلانے میں مصروف ہیں) وہ اس سے باز نہ آئے اور اضراب کا معنی یہ ہے کہ ان کفار کی صورت حال ان ماقبل اقوام کی صورت حال سے زیادہ تعجب خیز ہے کیونکہ کفار نے ان اقوام کے قصوں کو ساعت کیا اور ان کی ہلاکت کے آثار بھی دیکھے اور (اس کے باوجود) انہوں نے آپ ﷺ کو ان ماقبل کے مقابلے میں بہت زیادہ شدت سے جھٹلایا۔

﴿وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ﴾

(حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے) وہ اس سے گم (غائب) نہیں ہو جائیں گے جیسا کہ احاطہ کے اندر کی چیز اس احاطہ سے (کسی بھی حالت میں) غائب نہیں ہوسکتی۔

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ﴾

(بلکہ وہ کمال شرف والا قرآن ہے)

پس وہ مقدس کتاب ہے جسے انہوں نے جھٹلایا یہ اپنی ترتیب اور معنی میں یکتی ہے اور اسے اضافت کے ساتھ قرآن مجید بھی پڑھا گیا ہے یعنی بڑی شان والے رب کا کلام ہے۔

﴿فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾

(ایسی لوح میں لکھا ہے جو محفوظ ہے)

تحریف (تبدیلی سے (یعنی جو لوح ہر قسم کی تحریف (تبدیلی سے) پاک ہے اور نافع مدنی نے اسے رفع کے ساتھ محفوظ پڑھا ہے اس شرط پر کہ یہ قرآن کی صفت ہے اور اسے لُوحٍ بھی پڑھا گیا ہے جس کا معنی ہے ایسی ہوا جو ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے اور یہ لوح میں ہے۔

" الحمد لله اللهم اجعل كل الساعة فوزاً لنا "

سورة نمبر 09	سوره الطارق	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	کل آیات 17

﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ﴾

(قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی) اس ستارے کی رات کو ظاہر ہوتا ہے اور الطارق کو اصل میں چلنے والے (مسافر) کے لئے وضع کیا گیا ہے پھر عرف عام میں ہر اس شخص کے لئے خاص ہوگیا جو رات کو آیا کرتا تھا پھر یہ رات کو چمکنے والے ستارے کے لئے استعمال کیا جانے لگا (ثم استعمل للبادی فیه) البادی سے پہلے اس کا موصوف الکوکب محذوف ہے۔

﴿وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الطَّارِقُ النَّجْمُ الثَّاقِبُ﴾

(اور آپ کو کیا معلوم یہ رات کو آنے والا کیا ہے؟ ایک تارا نہایت تاباں)

الثاقب کا معنی المضی کر رہے ہیں یعنی چمکنے والا گویا کہ ثاقب (چمکنے والا ستارہ) اپنی روشنی کے ساتھ تاریکیوں میں سوراخ کر دیتا ہے اور ان میں آر پار ہو جاتا ہے یا افلاک میں اپنی روشنی کے ساتھ سوراخ کر دیتا ہے (الافلاک کا عطف الافلام پر ہے)

"النجم الثاقب " سے مراد جنس ہے یعنی کوئی خاص ستارہ مراد نہیں ہے بلکہ ستاروں کی کل جنس مراد ہے (اس صورت النجم الثاقب اوپر الف لام جنسی کا ہو گا) یا النجم الثاقب سے مراد ایسا ستارہ ہے جو ثقب کے نام سے مشہور ہے اور وہ زحل (ستارہ) ہے (اس صورت میں النجم الثاقب کے اوپر الف لام عہدی ہوگا)

سوال: اللہ تعالیٰ نے "وما ادراك ما الطارق" فرمایا پھر خود ہی وضاحت فرمادی کہ وہ "النجم الثاقب" ہے اس انداز سے کلام کو القاء کرنے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

جواب: پہلی مرتبہ عام وصف سے تعبیر کیا گیا ہے پھر جو چیز اس کو خاص کر رہی ہے اس کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی اس کی عظمت شان کو بڑھانے کے لئے۔

﴿اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا﴾

(کوئی شخص ایسا نہیں جس پر کوئی نہ (ہو)) شان (حالت) یہ ہے کہ ہر نفس پر ایک ﴿حَافِظ﴾ (محافظ) نگہبان ہے (الشان سے مراد ضمیر محذوف ہے یعنی ان کا اسم ضمیر شان محذوف ہے ان مخففہ میں مثقلہ ہے) اور لام فاصل ہے (جسے نحویوں کی اصطلاح میں لام مفارقہ کہا جاتا ہے اور لام فاصل سے مراد یہ ہے کہ لما کے اوپر جو لام ہے یہ ان مخففہ میں مثقلہ ہے اور ان نافیہ کے درمیان فرق کو بیان کرنے کے لئے آیا ہے کیونکہ ان نافیہ کی خبر پر لام نہیں آتا) اور ما زائدہ ہے اور ابن عامر شامی عاصم اور حمزہ نے اما پڑھا ہے (جیسا کہ ہماری قرأت ہے) اس شرط پر کہ یہ الا کے معنی میں ہے (اس صورت میں) ان نافیہ ہوگا اور جملہ دونوں صورتوں میں جواب قسم ہوگا۔

(وضاحت ملاحظہ فرمائیں)

امام حمزہ ابن عامر شامی اور عاصم کی قرأت ہے یہ بات پہلی معلوم ہوگئی کہ لمّا کی کل ۳ صورتیں ہیں۔

(۱) لما شرطیہ: یہ دو فعلوں پر داخل ہوتا ہے دونوں عموماً فعل ماضی ہوتے ہیں۔

(۲) لما جوازمہ: یہ ایک فعل مضارع پر داخل ہوتا ہے اور اس کے آخر کو جزم دینے کے ساتھ ساتھ اسے ماضی منفی کے معنی میں کر دیتا ہے جیسے (لما یضرب)

(۳) لما بمعنی الا: یہ الا کے معنی میں ہوتا ہے جیسے "ان کل نفس لما علیها حافظ"

علی الوجہین دو صورتیں کونسی ہیں۔

(۱) اگر انَّ مخففہ ہو تو تب بھی جواب قسم وہی بنے گا۔

(۲) اگر انَّ نافیہ ہو تو تب بھی جواب قسم وہی بنے گا۔

﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ﴾

(سو انسان دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے) جب اللہ تعالیٰ اس بات کا ذکر فرمایا کہ ہر نفس پر ایک محافظ (نگہبان) ہے تو اس کے بعد انسان کو تاکیدی حکم کہ وہ اپنے مبداء (ابتداء) کی طرف غور و فکر کرے تاکہ وہ دوبارہ پیدا کیے جانے کی صحت کا یقین کرے اور وہ اپنے نگہبان کے پاس صرف وہی بات لکھوائے جو آخرت میں اسے خوش کرے۔

دوسرا ترجمہ: وہ اپنے محافظ کے پاس کوئی بات نہ لکھوائے مگر جو آخرت میں اسے خوش کرے۔

﴿خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ﴾

(اسے پیدا کیا گیا ہے اُچھلتے پانی سے)

یہ استفہام کا جواب ہے۔

سوال: دفق کا معنی دھکیلنا ہے اور دافق اسم فاعل کا صیغہ ہے پھر ترجمہ کس اعتبار سے درست ہوگا؟

جواب: ماء دافق ماء ذی دفق کے معنی میں ہے (یعنی اسم فاعل نسبت کے معنی میں ہے جیسا کہ "فهو فی عیشة الراضیه" اور ماء دافق کا معنی ہوگا ایسا پانی جس میں دھکیلنے کی صلاحیت (گنجائش) ہو۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے انسان کو مرد و عورت دونوں کے پانی سے پیدا فرمایا جبکہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک پانی کا ذکر فرمایا ہے؟

جواب: اس سے مراد عورت کی رحم میں دونوں پانیوں کا آمیزہ ہے (یعنی نہ تو مرد کا پانی مراد ہے نہ ہی عورت کا بلکہ ان دونوں پانیوں سے ملا ہوا پانی مراد ہے)

اپنے اس فرمان کی وجہ سے

﴿يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ﴾

(جو (مردوں وزن کی) پیٹھ اور سینے کی ہڈیون کے درمیان سے نکلتا ہے) مرد کی پیٹھ اور عورت کے سینہ کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے اور ترائب سے مراد عورت کے سینہ کی ہڈیاں ہیں۔

(اعتراض) اس آیت پر بعض ملحدین نے اعتراض کیا ہے کہ مادہ منویہ کے خروج کا کیا مطلب ہے؟

جواب: خروج کا مطلب اگر جسم سے باہر خارج ہونا ہو تو بداہۃً غلط ہے کیونکہ منی کا خروج یہاں سے نہیں ہوتا اگر خروج کا معنی اس کا مقر ہے جہاں وہ جمع ہوتی ہے تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ اس کا ذخیرہ اوعیۃ المنی (خصیتین) ہیں نہ کہ پشت وسینہ اگر خروج کا مقصد یہ ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی یہاں تیار ہوتے ہیں تو بھی درست نہیں کیونکہ اس کے بنانے میں سب سے زیادہ حصہ دماغ ہے نہ کہ صلب وترائب کا۔

جواب: اگر یہ بات صحیح ہو کہ نطفہ ہضم رابع سے اور تمام اعضاء سے کچھ حصہ جدا ہو کر بنتا ہے یہاں تک کہ اس نطفہ میں اس بات کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ اس سے انہی اعضاء کی مثل (نئے) اعضاء پیدا ہوسکیں اور منی کے قرار پذیر ہونے کی جگہ وہ رگیں ہیں جو خصیتین کے پاس ایک دوسرے کے ساتھ لپٹی ہوتی ہیں اس صورت میں دماغ سب سے عظیم عضو ہے جو نطفہ (منی) کو پیدا کرنے میں معاونت کرتا ہے اسی وجہ سے منی (کی رنگت) دماغ (رنگت) کے مشابہ ہوتی ہے اور جماع میں زیادتی دماغ میں کمزوری کو جلدی لاتی ہے (اسی وجہ سے جماع میں انزال جلدی ہوتا ہے اور دماغ کا ایک نائب ہے جو کہ حرام مغز ہے اور یہ پیٹھ میں ہوتا ہے اور حرام مغز کی بہت سی چھوٹی چھوٹی رگیں سینہ کی ہڈیوں میں اترتی ہیں پھر پیٹھ اور سینہ کی ہڈیاں منی کے ٹھکانے کے سب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں پس اس وجہ سے دونوں کو خصوصاً ذکر فرمایا اور الصلب کو دو فتحوں کے ساتھ (الصَّلَب) پڑھا گیا ہے اور دو ضموں کے ساتھ (الصُّلُب) بھی پڑھا گیا ہے اور اس میں ایک چوتھی لغت بھی ہے وہ الصالب ہے۔

1	الصُلْب	3	الصَّلَب
2	الصُلب	4	الصالب

﴿اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ﴾

(بے شک وہ اس کو پھر واپس لانے پر قادر ہے) انہ کی "ہ" ضمیر خالق کی طرف راجع ہے۔

سوال: یہاں پر تو مرجع مذکور ہی نہیں پھر خالق کی جانب ضمیر کس طرح راجع ہوسکتی ہے؟

جواب: کبھی کبھی کلام میں صراحۃً مرجع مذکور نہیں ہوتا بلکہ کلام کا سیاق وسباق اس پر دلالت کررہا ہوتا ہے اور خلق فعل اس پر دلالت کررہا ہے۔

﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ﴾

(یاد کرو اس دن کو جب سب راز فاش کردیے جائیں گے) یعنی رازوں کو جان لیا جائے گا۔

ضمائر میں سے عمدہ اور اعمال میں سے پوشیدہ اشیاء اور ان دونوں ضمائر و اعمال میں سے بری اشیاء کو ممتاز کردیا جائے گا اور یہ عبارت (کلام) رجعہ کے لئے ظرف ہے۔

﴿فَمَا لَهٗ﴾

(پس نہ خود اس میں) (ہ ضمیر کا مرجع بتا رہے ہیں) انسان کے لئے کچھ نہیں ہوگا

﴿مِنْ قُوَّةٍ﴾ (زور ہوگا) یعنی اس کی ذات میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہوگی جس کے ذریعے وہ محفوظ رہ سکے

﴿وَّلَا نَاصِرٍ﴾

(اور نہ کوئی (دوسرا) مددگار ہوگا) جو اس کی حفاظت کرے

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ﴾

(قسم ہے آسمان کی جس سے بارش برستی ہے)

آسمان ہر چکر میں اس جگہ کی جانب لوٹنے والا ہے جس جگہ سے وہ حرکت کرتا ہے اور کہا گیا ہے کہ الرجع سے مراد بارش ہے اس کے ساتھ بارش کا نام رکھا گیا ہے جس طرح ''اوب'' کے ساتھ بارش کا نام رکھا گیا ہے (ان دونوں میں لوٹنے کا معنی پایا جاتا ہے) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بارش کو وقتاً فوقتاً لوٹا تا رہتا ہے یا اس وجہ سے کہ رجع کہا گیا ہے بادل سمندروں سے پانی اٹھاتے ہیں پھر انہیں زمین کی طرف لوٹا دیتے ہیں اور اسی بناء پر جائز ہے کہ السماء سے مراد بادل ہو۔

﴿وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ﴾

(اور زمین کی جو (بارش سے) پھٹ جاتی ہے)

ذات الصدع سے مراد زمین کا نباتات اور چشمہ جات کے ساتھ پھٹ جانا ہے (غور طلب)

﴿اِنَّهٗ﴾

(بلاشبہ یہ قرآن) ''ہ'' ضمیر کا مرجع کے بارے میں بتا رہے ہیں یعنی بے شک قرآن۔

﴿لَقَوْلٌ فَصْلٌ﴾

(قول فیصل (ہے)) حق و باطل کے درمیان میں۔

﴿وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾

(اور یہ ہنسی مذاق نہیں ہے) یہ تمام کا تمام سنجیدہ ہے "فانه جد كله"

﴿اِنَّهُمْ﴾

(یہ لوگ) (ھم ضمیر کا مرجع بتا رہے ہیں) یعنی اھل مکہ۔

﴿يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا﴾

(طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں) قرآن کو باطل کرنے میں اور اس کے نور کو بجھانے میں۔

﴿وَّاَكِيْدُ كَيْدًا﴾

(اور میں بھی تدبیر فرما رہا ہوں) یعنی میں بھی ان سے مقابلہ کر رہا ہوں ان اپنی خفیہ تدبیر کے ذریعے ان کو درجہ بدرجہ عذاب کے قریب کرنے اور ان سے انتقام لینے میں اس طرح کہ کفار اس چیز کا گمان بھی نہیں رکھتے۔

﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ﴾

(پس آپ کفار کو (تھوڑی سی) مہلت اور دے دیں) آپ ﷺ ان سے انتقام لینے کے ساتھ مشغول نہ ہو جائیں یا ان کی ہلاکت کو جلدی نہ فرمائے

﴿اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا﴾

(کچھ وقت انہیں کچھ نہ کہیے) یعنی تھوڑی سی مہلت دے دیجئے مہلت کو دوبارہ ذکر کرنا اور فعل کے صیغہ کی بناوٹ کو تبدیل کرنا نبی ﷺ کے لئے تسکین کی زیادتی کے حصول کے لئے ہے۔

"اللهم افهم القرآن والحديثه"

سورۃ نمبر 10	سورہ الاعلیٰ	بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ	کل آیات 19

﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّكَ الۡاَعۡلَى﴾

((اے حبیب!) آپ پاکی بیان کریں اپنے رب کے نام کی جو سب سے برتر ہے) آپ ﷺ اپنے رب کے اسم کو پاک سمجھیے اس میں فضول تاویلات کے ذریعے الحاد کرنے سے آپ ﷺ اپنے رب کے اسم پاک سمجھے اس کے غیر پر اس اسم کا اطلاق کرتے ہوئے اور یہ گمان کرتے ہوئے کہ دونوں اسم برابر ہیں اور ایسے ذکر کے ساتھ پاکی بیان کیجئے جس میں تعظیم کا پہلو ہو اور اسے سبحان ربی الاعلی بھی پڑھا گیا ہے

الحاد: سیدھا راستے سے ہٹ جانا **الزائعه:** فضول

(یہ قرأت شاذ ہے اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے) اور حدیث میں مذکور ہے کہ جب آیت "**فسبح باسم ربك العظيم**" نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اس آیت کو اپنے رکوع میں رائج کرلو (رکھلو) اس سے پہلے اصحاب رکوع میں **اللهم لك ركعت** اور سجدوں میں **اللهم لك سجدت** پڑھا کرتے تھے۔

﴿الَّذِىۡ خَلَقَ فَسَوّٰى﴾

(جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا پھر (ظاہری اور باطنی قوتیں دے کر) درست کیا) جس نے ہر شئی کو پیدا فرمایا اور پھر اس کی تخلیق کو برابر بنایا اس چیز کے ساتھ جس سے اس کا کمال واقع ہوتا ہے اور اس کا معاش مکمل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خلق کا مفعول ذکر نہیں فرمایا مقصد یہ ہے کہ ہر چیز وہ خالق ہے جس کسی کو بھی نعمت وحدہ سے نوازا گیا ہے اس کو نوازنے والا اور کوئی نہیں، وہی ذات ہے بس وہی ذات ہے یعنی بہت زیادہ عموم کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

﴿وَالَّذِىۡ قَدَّرَ﴾

(اور جس نے (ہر چیز کا) اندازہ مقرر کیا) یعنی تمام اشیاء کی اجناس، انواع، اشخاص، مقداروں کی صفات، افعال اور اموات کا اندازہ مقرر فرمایا

﴿فَهَدٰى﴾

(پھر اسے راہ دکھائی) اللہ تعالیٰ نے اسے طبعی طور پر اس کے افعال کی جانب متوجہ کیا یا میلان پیدا کرنے کے ساتھ اور الہامات و دلائل کو نصب کرنے اور آیات کو نازل کرنے ساتھ اختیاری طور پر اس کو افعال کی جانب متوجہ فرمایا۔

"**فوجهه الى افعاله طبعاً**" اس ہدایت کا تعلق حیوانات اور انسانوں سے ہے۔

"**فوجهه الى افعاله اختيارا**" اس ہدایت کا تعلق صرف انسانوں کے ساتھ خاص ہے۔

نصب الدلائل سے مراد دلائل عقلیہ ہیں جبکہ انزال الآیات سے مراد دلائل نقلیہ وسمعیہ ہیں۔

﴿وَالَّذِىۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰى﴾

(اور جس نے زمین سے چارا نکالا) اس چیز کو اگایا جس کو چوپائے چرتے ہیں۔

﴿فَجَعَلَهٗ﴾

(پھر اسے بنادیا) یعنی اس کے سر سبز و شاداب ہونے کے بعد۔

﴿غُثَآءً اَحۡوٰى﴾

(کوڑا سیاہی مائل) یعنی خشک سیاہ بنادیا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "احوی" "مرعی" سے حال ہے یعنی ترجمہ ہوگا سیاہ نکالا اس اعتبار سے کہ وہ شدید سرسبزی کی وجہ سے سیاہ ہے۔

﴿سَنُقۡرِئُكَ﴾ (ہم خود پڑھائیں گے) یعنی جبرائیل علیہ السلام کی زبان پر یا ہم عنقریب آپ ﷺ کو قرأت الہام کر کے قاری بنادیں گے

﴿فَلَا تَنْسٰی﴾

(پس آپ (اسے) نہ بھولیں گے) حافظہ کے قوی ہونے ہونے کی وجہ سے سرے سے ہی نہیں بولیں گے باوجود اس کہ آپ امی ہیں۔تا کہ یہ آپ ﷺ کے لئے معجزہ (نشانی) بن جائے ان اشیاء کی خبر دینے سے ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ "لاتنسی "نہی کا صیغہ ہے۔

سوال: اگر"لاتنسی"نہی کا صیغہ ہوتا تو اس کے آخر میں حرف علت الف حذف ہو جاتا جبکہ حرف علت تو قائم مقام ہے؟

جواب: یہاں الف فاصلہ کے لئے ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "السبیلا" (اس میں بھی الف فاصلہ کے لئے ہے)

﴿اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ﴾

(بجز اس کے جو اللہ چاہے) شاء فعل کا مفعول ہے اکثر محذوف ہوتا ہے امام بیضاوی اس کی جانب اشارہ فرمارہے ہیں۔جس کا بھلادینا اللہ چاہے یعنی اسکی تلاوت منسوخ ہو جائے اور کہا گیا کہ اس سے مراد قلت وندرت ہے کیونکہ روایت کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ نماز میں قرأت کے دوران ایک آیت ساقط فرمائی تو ابی ابن کعب رضی اللہ تعالی عنہ نھے گمان کیا کہ (شاید) اس آیت کو منسوخ کر دیا گیا ہے پس انہوں نے حضور ﷺ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا! میں اس آیت کو بھول گیا یا (اس کی نفی سے مراد) سرے سے ہی بھولنے کی نفی کرنا ہے کیونکہ قلت بھی نفی میں استعمال ہوتی ہے

﴿اِنَّہٗ یَعْلَمُ الْجَہْرَ وَمَا یَخْفٰی﴾

(بے شک وہ جانتا ہے ظاہر کو اور جو چھپی ہوتی ہے) یعنی جو حالات (اشیاء) تمہارے احوال میں سے ظاہر اور پوشیدہ ہیں یا آپ ﷺ کا جبرئیل کے ساتھ بلند آواز سے قرأت کرنا اور بھول جانے کا خوف جو کہ آپ ﷺ کو بلند آواز سے قرأت کرنے کی جانب مدعو کرتا ہے آپ لوگوں کو باقی رکھنے میں یا بھلا دینے میں جو بھلائی ہے اس کو جانتا ہے۔

﴿وَنُیَسِّرُکَ لِلْیُسْرٰی﴾

(اور ہم سہل بنادینگے آپ کے لیے آسان (شریعت) پر عمل) یعنی وحی کو یاد رکھنے یا دین کو نافذ کرنے میں آسان راستہ کے لئے آپ ﷺ کو تیار فرمائیں گے ۔اور ہم آپ ﷺ کو اس راستہ کے لئے موافق بنادیں گے اور اسی نکتہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے "نسیر لك "نہیں بلکہ "ستقرئك "کے اوپر عطف کرتے ہوئے "نسیرك "ذکر فرمایا" ہے اور انه یعلم الجھر "جملہ معترضہ ہے۔

﴿فَذَکِّرْ﴾

(پس آپ نصیحت کرتے رہیے) اس کے بعد کے معاملہ آپ ﷺ کے لئے آسان ہو گیا

﴿اِنْ نَّفَعَتِ الذِّکْرٰی﴾

(اگر نصیحت فائدہ مند ہو) شاید کہ یہ شرطیہ کلام نصیحت کو مکرر (بار بار) کرنے اور بعض لوگوں سے مایوس حاصل ہونے کے بعد نازل ہوا۔(آیا) تا کہ آپ ﷺ اپنے نفس کو نہ تھکائیں اور ان کے لئے پریشان (گھمبیر) نہ ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ آپ ﷺ ان پر جبر کرنے والے نہیں یا پھر یہ کلام نصیحت کیے جانے والے لوگوں کے مذمت کے لئے اور ان میں نصیحت کو بعید گمان کرنے کے لئے ہے۔

یا اس چیز کا شعور دلانے کے لئے ہے کہ نصیحت کرنا اس وقت واجب ہوتا ہے جب اس کے نفع کا گمان ہو اور اسی وجہ سے روگردانی کرنے والے سے اعراض کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

﴿سَیَذَّکَّرُ مَنْ یَّخْشٰی﴾

(سمجھ جائے گا جس کے دل میں (خدا کا) خوف ہوگا) یعنی جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس سے نصیحت ونفع حاصل کرے گا (کیونکہ) اللہ سے ڈرنے والا ہی اس میں غور و فکر کرتا ہے پس وہ اس کی حقیقت کو جان لیتا ہے۔اور "من یخشی "عارف ومتردد تمام کو شامل ہے۔

﴿وَیَتَجَنَّبُھَا﴾ (اور دور رہے گا اس سے) ھا ضمیر کا مرجع بتا رہے ہیں نصیحت سے اجتناب کرے گا۔

﴿الْاَشْقَى﴾

(بدبخت) کافر کیونکہ وہ فاسق سے زیادہ بدبخت (شقی) ہے کیونکہ کافر آخرت پر ایمان نہیں رکھتا جبکہ فاسق آخرت پر تو ایمان رکھتا ہے بھلے اس کے اعمال جیسے بھی ہیں۔ یا پھر اشقی سے مراد وہ شخص ہے جو کہ کافروں میں سب سے زیادہ بدبخت ہے اس لئے کہ وہ کفر میں حد درجہ غلو کرنے والا ہے۔

﴿الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى﴾

(جو (بالآخر) بڑی آگ میں داخل ہوگا) النار الکبری سے مراد جھنم کی آگ ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا (تمہاری دنیا کی آگ) جھنم کی آگ کے ستر جزؤں میں سے ایک جزء ہے یا پھر النار الکبری سے مراد جھنم کا سب سے نیچے والا طبقہ ہے۔

﴿ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا﴾

(پھر نہ وہاں مرے گا) تاکہ اس کے بعد راحت حاصل کرے۔

﴿وَلَا يَحْيٰى﴾

(اور نہ جئیے گا) ایسی زندگی جو اسے نفع دے۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾

(بے شک اس نے فلاح پائی جس نے اپنے آپ کو پاک کیا) یعنی کفر و معصیت سے پاک کیا یا جس نے بہت زیادہ تقوی اختیار کیا اس صورت میں یہ "الزکاء" سے ماخوذ ہوگا یا معنی یہ ہوگا جس نے نماز کے لئے پاک کیا یا جس نے زکوۃ ادا کی۔

﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ﴾

(اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا) اپنے دل اور زبان کے ساتھ۔

﴿فَصَلّٰى﴾

(اور نماز پڑھتا رہا) جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان "اقم الصلوۃ لذکری" اور یہ بھی جائز ہے کہ ذکر سے مراد تکبیر تحریمہ ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تزکی کا معنی ہے جس نے صدقہ ادا کیا اور عید کے تکبیر کہی اور نماز عید ادا کی۔

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾

(البتہ تم لوگ دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو) تم وہ کام سرانجام نہیں دیتے جو آخرت میں تمہیں خوش کرنے والے ہیں۔

سوال: اس سے پہلے اللہ تعالیٰ غائب کے صیغے کے ساتھ کلام فرما تا رہا ہے اور اس آیت میں مخاطب کا صیغہ ذکر فرمایا اس میں کیا حکمت ہے اور خطاب کن لوگوں کو ہے؟

جواب: التفات کے طریقہ پر خطاب بدبختوں کو ہے یا پھر اس سے پہلے "قل" مضمر ہے یا پھر خطاب تمام لوگوں کو ہے کیونکہ دنیا کے لئے کوشش کرنا عموماً زیادہ ہوتی ہے (یعنی انسان دنیا کے لئے کوشش کرتا ہے عمومی طور پر) اور ابوعمرو "یا" کے ساتھ "یؤثرون" پڑھا ہے۔

﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾

(حالانکہ کہیں بہتر ہے اس سے اور باقی رہنے والی ہے)

پس آخرت کی نعمتیں بالذات لذت بخشنے والی ہیں اور ہر قسم کے سردرد سے پاک ہیں اور ان میں کوئی انقطاع نہیں ہے۔

﴿اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى﴾

(یقیناً یہ (سب کچھ) اگلے صحیفوں میں لکھا ہوا ہے)

یہ اشارہ ہے ان اشیاء کی جانب جن کا ذکر قد افلح کے تحت گزر چکا ہے کیونکہ قرآن دین کو جامع ہے اور گزشتہ آسمانی نازل کی گئی کتب کا خلاصہ ہے۔

﴿ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى﴾

((یعنی) ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں) یہ جملہ الصحف الاولیٰ سے بدل ہے۔

سورۃ نمبر 11	سورہ الغاشیہ	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	کل آیات26

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ﴾

(کیا پہنچی ہے آپ کو چھا جانے والی آفت کی خبر)

امام بیضاوی الْغَاشِيَة کا معنی بیان کرر ہے ہیں الداھیۃ یعنی ایسی مصیبت جو اپنی شدت کے ساتھ لوگوں کو ڈھانپ لے گی یعنی وہ قیامت کا دن ہے یا پھر وہ آگ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے تغشی وجوھھم النار

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ﴾

(کتنے ہی چہرے اس دن ذلیل وخوار ہوں گے) خَاشِعَةٌ یعنی ذلیلۃ

﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾

(مشقت میں مبتلا، تھکے ماندے)

یعنی وہ ایسے کام کریں گے جن سے تھکے ہوئے ہوں گے جیسے بھاری کم زنجیروں کو کھینچنا اور جس طرح اونٹ کیچڑ میں پھنس جاتا ہے اسی طرح آگ میں پھنس جانا اور دوزخ کے ٹیلوں اور وادیوں میں چڑھنا اور اترنا

یا انہوں نے ایسے کام کیے اور ان میں کوشش کرتے رہے جو انہیں اس دن کچھ نفع نہیں دیں گے

تعمل ما تتعب کی عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ مضارع کے معنی میں ہے

عملت و نصبت کی عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ماضی کے معنی میں ہے

﴿تَصْلٰى نَارًا﴾

(داخل ہوں گے آگ میں) تصلی کا معنی تدخل ہے اور امام ابو عمرو بن العلا البصری، امام یعقوب حضرمی بصری اور امام ابو بکر عاصم بن بہدلہ الکوفی نے تُصْلٰی مجہول پڑھا ہے اس صورت میں یہ اصلاہ اللہ سے ماخوذ ہوگا اور اسے مبالغہ کے لیے تشدید کے ساتھ تُصَلّٰی بھی پڑھا گیا ہے

﴿ حَامِيَةً﴾

(دہکتی ہوئی) ایسی آگ جو گرمی میں انتہاء کو پہنچی ہوگی

﴿ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ﴾

(انہیں پلایا جائے گا کھولتے ہوئے چشمے سے) ایسے چشموں سے جو گرمی وحدت میں انتہاء کو پہنچے ہونگے

﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ﴾

(انہیں کوئی کھانا نہ ملے گا بجز خار دار جھاڑ کے) خشک جھاڑی اور یہ ایسی جھاڑی ہے جسے اونٹ بھی اس وقت تک چرتا ہے جب تک وہ تر رہے اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد آگ کا درخت ہے جو غریع کے مشابہ ہے

سوال اللہ تعالیٰ نے جہنمیوں کے طعام کا ذکر کرتے ہوئے ایک سورۃ میں "لیس لھم طعام الا من غسلین" فرمایا ہے جبکہ یہاں لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ فرمایا ہے ان کے درمیان تطبیق کیسے ممکن ہے؟

جواب شاید کہ ضریع ان لوگوں کا کھانا ہے اور زقوم وغسلین ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کا کھانا ہوگا

یااس سے مراد ایسا کھانا ہوگا جسے اس کے نقصان دہ ہونے اور عدم نفع کیوجہ سے اونٹ بھی کھانے سے اجتناب کرتا ہےاور دور بھاگتا ہےاور جیسا کہ اللہ تعالی نے ارشادفرمایا ﴿لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِن جُوعٍ﴾ (جو نہ فربہ کرے گا اور نہ بھوک دور کرے گا) اور طعام سے مقصود دو امور میں سے ایک ہے یعنی جہنم میں مختلف طبقات ہیں تو عین ممکن ہے کہ ایک طبقہ زقوم کا ہو اور ایک طبقہ غسلین کا ہو

﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ﴾

(کتنے ہی چہرے اس دن بارونق ہوں گے) رونق والے ہونگے یا نعمتوں سے لطف حاصل کرنے والے ہونگے

ذات بهجة سے اس جانب اشارہ ہے کہ ناعمہ نعومۃ سے ماخوذ ہے

ذات متعمة سے اس جانب اشارہ ہے کہ ناعمۃ نعیم سے ماخوذ ہے

﴿لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ﴾

(اپنی کاوشوں پرخوش ہوں گے) اپنے اعمال پر راضی ہوگے جب وہ ان کا ثواب دیکھیں گے

﴿فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ﴾

(عالیشان جنت میں) جو محل کے اعتبار سے بلند ہے یا پھر قدر و منزلت کے اعتبار سے بلند ہے،

﴿لَّا تَسْمَعُ﴾

(نہ سنیں گے) اے مخاطب تو نہیں سنے گا یا وہ چہرے نہیں سنیں گے اور امام ابن کثیر مکی ،امام ابو عمرو بن العلا البصری اور رویس نے یاء کے ساتھ مجہول ہونے کی بناء پر پڑھا ہےاور امام نافع مدنی نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے

﴿فِيهَا لَاغِيَةً﴾

(وہاں کوئی لغو بات) لغو بات نہیں سنیں گے / لغو کلمہ نہیں سنیں گے / ایسے نفس کو نہیں سنیں گے جو لغو بات کریں کیونکہ اھل جنت کا کلام ذکر اور حکمت کی باتیں ہوگی

وضاحت

1 لغو سے اس جانب اشارہ ہے کہ لَاغِيَة مصدر ہے

2 :کلمة ذات لغو سے اس جانب اشارہ ہے کہ لَاغِيَة اسم فاعل ہےاور نسبت کے معنی میں ہےاور کلمة موصوف محذوف کی صفت ہے

3 نفسا ذات لغو سے اس جانب اشارہ ہے کہ لَاغِيَة نفسا موصوف محذوف کی صفت ہے

﴿فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ﴾

(اس میں چشمہ جاری ہوگا) یعنی ان چشموں کا پانی چلتا رہے گا اور منقطع نہیں ہوگا، عین کو نکرہ ذکر کرنا تعظیم کے لیے ہے

﴿فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ﴾

(اس میں اونچے اونچے تخت (بچھے) ہوں گے) وہ پلنگ یا تخت کی اونچائی کے اعتبار سے بلند ہونگے یا پھر قدر و منزلت کے اعتبار سے بلند ہونگے

﴿وَأَكْوَابٌ﴾

(اور ساغر) یہ کوب کی جمع ہےاور کوب ایسے برتن کو کہتے ہیں جس کا کوئی دستہ نہ ہو

﴿مَّوْضُوعَةٌ﴾

((قرینے سے) رکھے ہوں گے) ان کے سامنے (اھل جنت کے سامنے)

﴿وَنَمَارِقُ﴾ (اور گاؤ تکیے) یعنی تکیے اور یہ نمرقۃ کی جمع ہے فتحہ کے ساتھ اور ضمہ کے ساتھ

فتحہ کے ساتھ نَمَرقۃ،ضمہ کے ساتھ نُمُرقۃ

﴿مَصْفُوْفَةٌ﴾

(قطار در قطار لگے ہوں گے)یعنی ان میں سے بعض، بعضوں کے ساتھ صف در صف لگے ہونگے

﴿وَّزَرَابِیُّ﴾

(اور قیمتی قالین) قالین بچھے ہوئے ہونگے یہ(زَرَابِیُّ)زربی کی جمع ہے

﴿مَبْثُوْثَةٌ﴾

(بچھے ہوں گے)بچھائی گی ہونگی

﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ﴾

(کیا یہ لوگ(غور سے)نہیں دیکھتے)غور وفکر کرنے کے اعتبار سے

﴿اِلَى الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ﴾

(اونٹ کو کیسے(عجیب طرح)پیدا کیا گیا ہے)ایسی تخلیق جو اللہ تعالی کے کمال قدرت اور حسن تدبیر پر دلالت کرتی ہے اس طرح کہ اسے بھاری بھر کم بوجھ کو دور دراز کے علاقوں تک لے جانے والا بنایا اور بوجھ لادنے کے لیے عظیم الجثہ بنایا اور بوجھ کے ساتھ اٹھنے والا بنایا اور جو اس کو چلائے اس کا مطیع بنایا اور لمبی گردن والا بنایا تا کہ وہ بوجھ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہو اور ہر قسم کے نباتات سے چر سکے اور اسے دس دن یا اس سے بھی زیادہ پیاس برداشت کرنے والا بنایا تا کہ اس کے لیے طویل صحراؤں اور جنگلوں کا طے کرنا آسان ہو اور اس کے ساتھ دیگر منافع بھی ہیں اسی وجہ سے اس کا خصوصی ذکر فرمایا تا کہ حیوانات میں بکھری ہوئی تمام نشانیاں بیان کردی جائیں،اس نشانی کے ذریعے جو حیوانات میں سب سے افضل اور از روئے کاریگری کے سب سے بڑھ کر ہے اور اسی وجہ سے بھی خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا کیونکہ یہ عربوں کے نزدیک تمام اشیاء سے زیادہ پسندیدہ ہے اور یہ بھی کہ گیا ہے کہ اس جگہ استعارہ کے طور پر ابل سے مراد بادل ہیں

﴿وَاِلَى السَّمَآءِ كَیْفَ رُفِعَتْ﴾

(اور آسمان کی طرف اسے کیسے(عجیب طرح)بلند کیا گیا ہے)بغیر کسی ستونوں کے

﴿وَاِلَى الْجِبَالِ كَیْفَ نُصِبَتْ﴾

(اور پہاڑوں کی طرف کہ انہیں کیسے نصب کیا گیا ہے)یہ ایسا پختہ ہیں جو ادھر ادھر نہیں جھکتے

﴿وَاِلَى الْاَرْضِ كَیْفَ سُطِحَتْ﴾

(اور زمین کی طرف کہ اسے کیسے بچھایا گیا ہے)اسے بچھادیا گیا یہاں تک کہ وہ ایک بچھونا بن گئی اور ان چاروں افعال کو مبنی للفاعل متکلم کے صیغوں کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے(خلقتُ، رفعتُ، نصبتُ، سطحتُ)اور ضمیر منصوب جو کہ مفعول کی طرف راجع ہے اس کو حذف کردیا گیا ہے اور معنی یہ ہوگا کیا وہ ان مخلوقات کی طرف نہیں دیکھتے جو بچھونے اور مرکبات سے تعلق رکھتی ہیں تا کہ وہ اللہ تعالی کی کمال قدرت کا یقین کرتے اور اس کے دوبارہ اٹھائے جانے پر اس کی قدرت رکھنے کا انکار نہ کرتے اور اسے وجہ سے اس کے فورا بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کے معاملہ کو ذکر فرمایا اور نصیحت کے امر کو اس پر مرتب فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا ﴿فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ﴾ (پس آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں آپ کا کام تو سمجھانا ہی ہے)آپ علیہ السلام پر لازم نہیں کہ(کفار)غور وفکر نہیں کرتے اور نصیحت حاصل نہیں کرتے ءآپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ صرف پیغام پہنچادینا ہے

﴿لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ﴾

(آپ ان کو جبر سے منوانے والے تو نہیں ہیں)مصیطر کا ترجمہ مسلط کیا ہے امام حمزہ الکسائی الکوفی نے اسے اصل کے اعتبار سے ''س'' کے ساتھ پڑھا ہے اور امام حمزہ بن الذیات الکوفی نے اشمام کے ساتھ پڑھا ہے

﴿اِلَّا مَنۡ تَوَلّٰی وَ کَفَرَ﴾

(مگر جس نے روگردانی کی اور کفر کیا) اور جس نے روگردانی کی اور انکار کیا (یعنی کفر کیا) لکن سے اس جانب اشارہ ہے کہ اِلَّا مَنۡ تَوَلّٰی وَ کَفَرَ استثناء منقطع ہے اور استثناء منقطع کا ماقبل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا

﴿فَیُعَذِّبُہُ اللّٰہُ الۡعَذَابَ الۡاَکۡبَرَ﴾

(تو اللہ اس کو سخت عذاب دے گا) عذاب اکبر سے مراد آخرت کا عذاب ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ استثناء متصل ہے اور کفار سے جہاد کرنا اور ان کو قتل کرنا بھی تسلط ہے گویا کہ کفار کو دنیا میں جہاد اور آخرت میں جہنم کے عذاب کی وعید سنائی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے فرمان فذکر سے استثناء ہے یعنی فذکر الا من تولی وکفر، آپ نصیحت کریں مگر جو روگردانی کرے گا پس وہ بڑے عذاب کا مستحق ہو ہے اور ان کے درمیان جملہ معترضہ ہے اور یہ پہلے قول کی تاکید الا پڑھی جانے والی قرأت کرتی ہے جو حرف تنبیہ ہے

﴿اِنَّ اِلَیۡنَاۤ اِیَابَہُمۡ﴾

(بے شک انہیں (آخر) ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے)

﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا حِسَابَہُمۡ﴾ (پھر یقیناً ہمارے ہی ذمہ ان کا حساب لینا ہے) محشر میں، اس جگہ تخصیص کے لیے اور وعید میں مبالغہ کے لیے ع رکو مقدم کیا گیا ہے

سورۃ نمبر 13	سورہ الفجر	بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	کل آیات 30

﴿وَالۡفَجۡرِ﴾

(قسم ہے اس صبح کی) اللہ تعالیٰ نے صبح کی قسم اٹھائی ہے یا پھر صبح کے پھوٹنے کی قسم کھائی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے (والصبح اذا تنفس) صبح کی قسم جب وہ سانس لے یا صبح کی نماز کی قسم

اگر فجر اسم ہو تو اس کا معنی ہو گا ''صبح''

اگر فجر مصدر ہو تو اس کا معنی ہو گا فلق یا فجر سے پہلے صلوۃ کو مقدر مان لیا جائے گا۔

﴿وَلَیَالٍ عَشۡرٍ﴾

(اور ان (مقدس) دس راتوں کی) یعنی ذوالحجہ کی دس راتیں اور اسی وجہ سے فجر کی تفسیر یوم عرفہ کی صبح کے ساتھ کی ہے یا اس سے مراد رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی دس راتیں مراد ہیں

لیال کو نکرہ ذکر کرنا تعظیم کے لیے ہے اور اسے لیال عشر اضافت کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اس اعتبار سے عشر سے مراد دس دن ہیں

اور معنی ہو گا دس دنوں کی راتوں کی قسم

﴿وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ﴾

(اور قسم ہے جفت اور طاق (راتوں) کی)

اس قسم کا مصداق وہ تمام اشیاء ہیں جو جفت اور طاق ہیں یا پھر الشفع سے مراد مخلوق ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ومن کل شیء خلقنا زوجین'' اور ہم نے ہر چیز سے جوڑا جوڑا بنایا چونکہ مخلوق جوڑا جوڑا ہے اس لیے اسے شفع سے تعبیر کیا گیا ہے

اور وتر سے مراد خالق ہے کیونکہ وہ یکتا واکیلا ہے اور جن لوگوں نے اس کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے کہ

شفع سے مراد عناصر اربعہ	وتر سے مراد افلاک سبعہ
شفع سے مراد بارہ برج	وتر سے مراد سات سیارے

شفع سے مراد جفت نمازیں	وتر سے مراد طاق نمازیں
شفع سے مراد نحر کے دو دن	وتر سے مراد عرفہ کا دن (ایک مرفوع روایت میں بھی یہی آیا ہے کہ نحر کے دو دن اور عرفہ کا دن مراد ہے)

یا اس کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ تعبیر کیا ہے تو گویا کہ جو شاید کہ ہر قائل نے مدلول کی انواع میں سے ہر ایک کو الگ ذکر کیا جو توحید پر زیادہ دلالت کرنے والی ہیں یا دین میں زیادہ داخل ہیں یا ماقبل کلام کے لحاظ سے زیادہ موزوں (مناسب) ہیں یا پھر زیادہ منفعت ہیں جو شکر کو لازم کرنے والی ہیں۔

امام حمزہ بن الذیات الکوفی ،امام علی بن حمزہ الکسائی الکوفی کے علاوہ دوسرے قاریوں نے فتح کے ساتھ والوتر پڑھا ہے اور یہ دو لغتیں ہیں جیسے حبر اور حِبر۔

رحبر: عیسائیوں کے بڑے عالم کو کہتے ہیں حبر کی جمع احبار آتی ہے۔

﴿وَالَّيۡلِ اِذَا يَسۡرِ﴾

(اور رات کی جب گزرنے لگے)

جب وہ گزرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے والیل اذا ادبر

اور رات کے گزرنے کو قسم کے ساتھ اس لیے مقید کیا گیا ہے کہ رات کے پلٹنے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور نعمتوں کی زیادتی پر دلالت کرنے کی قوت موجود ہے یا پھر معنی یہ ہے کہ رات کی قسم جس میں انسان چلتا ہے جیسا کہ عربوں کے قول (صلی المقام) میں فعل کی نسبت ظرف کی طرف مجازا کی گئی ہے

سوال: ''یسر'' فعل مضارع معروف سے پہلے کوئی ایسا ادا تہ نہیں جس کی وجہ سے اس کے آخر سے ''ی'' حذف ہوگئی ہو تو پھر ''ی'' ے ساقط ہوگی؟

جواب: کسرہ پر اکتفاء کرتے ہوئے تخفیفا ''ی'' کو حذف کردیا گیا ہے۔

امام نافع مدنی ،امام ابو عمرو بن العلا البصری نے فواصل کی رعایت کرتے ہوئے وقف کے ساتھ خاص کیا ہے ابن کثیر مکی اور امام یعقوب حضرمی بصری نے سرے سے ہی ''ی'' کو حذف نہیں کیا (یعنی حالت وقف میں یا ملا کر پڑھنے دونوں صورتوں میں ''ی'' کو ثابت رکھا ہے۔ اور اسے حرف اطلاق (ی) کو تنوین سے بدلنے کے ساتھ (یسر) بھی پڑھا گیا ہے۔

(حروف علت الف۔ واو۔ ی کو حذف اطلاق کہتے ہیں)

﴿هَلۡ فِىۡ ذٰلِكَ﴾

(یقیناً اس میں) ذلک کے مشارالیہ کی جانب اشارہ کررہے ہیں کہ قسم یا وہ چیز جس کی قسم اٹھائی جارہی ہے۔

﴿قَسَمٌ﴾

(قسم ہے) اگر ذلک سے مراد مقسم بہ تو اس سے مراد قسم ہوگی معنی ہوگا کیا کیا مقسم بہ میں قسم ہے

اور اگر ذلک سے مراد قسم ہو تو اس سے مراد محلوف بہ ہوگا یعنی اس قسم میں مقسم بہ ہے

﴿لِّذِىۡ حِجۡرٍ﴾

(عقلمند کے لیے) وہ اس سے عبرت حاصل کرے اور جس چیز کو ثابت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس کو (قسم) کے ساتھ مؤکد کرے۔ حجر عقل کو کہتے ہیں عقل کو حجر کا نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ ان کاموں سے روکتی ہے جو نامناسب ہوتے ہیں۔ جس طرح اسے عقل اور لھیہ اور حصاۃ کہتے ہیں جو کہ احصاء سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی کسی چیز کو ضبط کرنا ہے

اور جس چیز کی قسم اٹھائی جارہی ہے وہ محذوف ہے اور وہ لنعذبن ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ﴾ (کیا آپ نے ملاحظہ نہ کیا کہ آپ کے رب نے کیا کیا عاد) دلالت کررہا ہے،

یعنی عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد جو کہ ھود علیہ السلام کی قوم تھی اور انکا نام رکھا گیا ہے ان کے باپ کے نام پر جیسا کہ بنو ہاشم کا نام ان کے باپ کے نام پر رکھا گیا ہے

﴿اِرَمَ﴾

(ارم کے ساتھ) یہ مضاف کے مقدر ہونے کی بناء پر عاد سے عطف بیان ہے یعنی سبط ارم یا اھل ارم اگر صحیح ہو کہ ارم ان کے شہر کا نام تھا۔

سوال: ارم، عاد کا پوتا تھا اور دادا ایک الگ ذات ہے اور پوتا الگ ذات ہے جبکہ متبوع مبین اور عطف بیان سے ایک ہی ذات مراد ہوتی ہے۔

جواب: کہا گیا ہے کہ ان کی پہلی قوم کا نام رکھا گیا ہے ان کے دادا کے نام پر حالانکہ وہ عاد اولی تھیا اور یہ علیت اور تانیث کے پائے جانے کی وجہ سے غیر منصرف ہے

﴿ذَاتِ الْعِمَادِ﴾

(جو اونچے ستونوں والے تھے) اونچی اونچی عمارتوں والے تھے یا طویل قد وقامت والے تھے یا وہ بلند مرتبہ (شان وشوکت) والے تھے اور ثابت قدم رہنے والے تھے۔

ذات البناء الرفیع سے اس جانب اشارہ ہے کہ یہ تشبیہ بلیغ ہے اور تشبیہ بلیغ وہ ہوتی ہے جس میں نہ تو اداۃ تشبیہ مذکورہ ہو اور نہ ہی وجہ اشبہ مذکور ہو۔ القدود الطوال اوالرفعہ والثبات دونوں سے اس جانب اشارہ ہے کہ یہاں استعارہ تصریحہ ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ عاد کے دو بیٹے تھے ایک کا نام شداد اور دوسرے کا نام شَدِید تھا اور یہ دونوں بادشاہ بنیا ور دونوں جابر تھے پھر شدید مر گیا تمام حکومت شداد کے ساتھ خاص ہوگئی اور وہ ساری دنیا کا بادشاہ بن گیا (چھوٹے۔ چھوٹے) بادشاہ اس کے مطیع ہوگئے پس اس نے جنت کا ذکر سنا تو عدن کے کسی صحرا میں اس کی مثل جنت بنائی اور اس کا نام ارم رکھا پس جب وہ مکمل ہوگئی تو وہ اپنے اھل وعیال کے ساتھ اس کی جانب چلا جب وہ اس سے ایک دن اور ایک رات کی مسافت پر تھا تو اللہ تعالی نے آسمان سے ان پر ا یک چیخ بھیجی اور وہ ہلاک ہوگئے اور عبداللہ بن قلابہ سے مروی ہے کہ ان کا ایک اونٹ گم ہوگیا وہ اس کی تلاش میں نکلے اور اس باغ تک جا پہنچے

﴿الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ﴾

(نہیں پیدا کیا گیا جن کا مثل (دنیا کے) ملکوں میں) یہ ارم کی دوسری صفت ہے اور اس میں ھا ضمیر کا مرجع ارم ہے خواہ اس سے مراد قبیلہ کا نام ہو یا شہر کا نام ہو (شہروں کے نام اور قبائل کے نام مؤنث ہوتے ہیں)

﴿وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ﴾

(اور ثمود کے ساتھ (کیا کیا) جنھوں نے کاٹا تھا چٹانوں کو) یعنی چٹانوں کو کاٹا اور اس سے گھر بنائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے و تنحتون من الجبال بیوتا (وہ پہاڑوں کو تراش کران سے گھر بناتے ہیں)

﴿بِالْوَادِ﴾

(وادی میں) وادی قری میں

﴿وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ﴾

(اور (کیا کیا) فرعون کے ساتھ جو میخوں والا تھا) فرعون کو لشکروں کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ذوی الاوتا داور ان میخوں کی وجہ سے جن کو وہ اس وقت گاڑتے تھے جب وہ کسی جگہ اترتے تھے یا پھر میخوں کی وجہ سے اسے ذوی الاوتاد کہا گیا ہے (فرعون جب کسی شخص کو عذاب دیتا تو اس کو زمین پر لیٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں میں میخیں گاڑھ دیا کرتا تھا)

﴿الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ﴾

(جنہوں نے سرکشی کی تھی (اپنے اپنے) ملکوں میں) یہ مذکورہ لوگوں کی صفت ہے جو قوم عاد وثمود اور فرعون ہیں یا پھر مزمت ہے جو حالت نصب یا رفع میں ہے

ذم منصوب بہ:یعنی اذم الذین طغوا فی البلاد

ذم مرفوع:یعنی ہم الذین طغوا فی البلاد

﴿فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ﴾

(پھر ان میں بکثرت فساد برپا کر دیا تھا) کفر وظلم کے ساتھ فساد برپا کر دیا

﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾

(پس آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا) ایسا عذاب جس میں عذاب کی کئی انواع واقسام کو شامل کر دیا گیا ہو اور سوط کی اصل خلط ہے اور چمڑے کی بنی ہوئی جس کے ساتھ مارا جاتا ہے اس رسی کو بھی سوط کہتے ہیں اور اس کو سوط اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ کہ اس کے دھاگے (ریشے) ملے ہوئے ہوتے ہیں۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس عذاب کو سوط کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو ان کے لیے دنیا میں واقع کیا گیا تھا اس بات کا شعور دلانے کے لیے کہ آدمی قیاس کرے عذاب میں جو ان کے لیے آخرت میں تیار کر رکھا ہے جیسے دنیا میں آپ سوط کے ساتھ تلوار کے ساتھ قیاس کرتے ہیں

﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾

(بے شک آپ کا رب (سرکشوں اور مفسدوں) کی تاک میں ہے) مرصاد ایسی جگہ کو کہتے ہیں جس میں تاڑنے والے تاڑتے ہیں مرصاد مفعال کا وزن ہے اور رصدہ سے ماخوذ ہے (امام بیضاوی اس جانب اشارہ ہے کہ مرصاد مفعال کے وزن پر اسم آلہ کا صیغہ نہیں بلکہ ظرف کا صیغہ ہے)

سوال: تاڑتا تو وہ ہے جسے علم نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ تو علیم بصیر ہے تو پھر یہاں ان ربك لبا لمر صاد کیوں ذکر فرمایا؟

جواب: یہ اصل میں تمثیل بنانے کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ سزا دینے کے ساتھ نافرمانوں کی تاڑ میں ہے

﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ﴾

(مگر انسان) یہ فرمان اللہ تعالیٰ کے فرمان ان ربك لبا لمر صاد کے ساتھ متصل ہے (یعنی معنوی طور پر اس کے ساتھ ربط ہے) گویا کہ کہا گیا ہے اللہ تعالیٰ بندے سے صرف آخرت کے لیے سعی (کوشش) چاہتا ہے، پس انسان تو وہ دنیا اور اس کی لذتوں ہی کے غم میں رہتا ہے

﴿اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ﴾

(بھی عجیب شئے ہے) کہ جب آزماتا ہے اسے اس کا رب) خوشحالی اور مال کے ساتھ آزماتا ہے۔

﴿فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ﴾

(یعنی اس کو عزت دیتا ہے اور اس پر انعام فرماتا ہے) مال وحشمت کے ساتھ

ترکیب ملاحظہ فرمائیں۔

مہما یکن من شئی فالانسان اکرمہ و نعمہ۔

"مہما یکن من شئی "شرط" ف جزائیہ" اکرمہ و نعمہ "جملہ فعلیہ ہو کر مبتدا کی خبر ملکر جملہ اسمیہ ہو کر جزا، شرط و جزا ملکر جملہ شرطیہ ہوا۔

﴿فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ﴾

(تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت بخشی) یعنی مجھے فضیلت دی اس شے کے سبب جو مجھے عطا کی اور یہ مبتدا کی خبر ہے اور مبتدا انسان ہے اور اما میں پائے جانے والے شرط کے معنی کے لیے ف لائی گئی ہے اور ظرف درمیان میں لائی ہے جو تقدیرا مؤخر ہے

گویا کہ کہا گیا ہے کہ رہا انسان تو وہ کہنے والا ہے کہ میرے رب نیت انعام کے ساتھ آزمانے کے ساتھ آزمانے کے وقت مجھے عزت دی اور اکا یہ فرمان بھی اسی طرح ہے کہ ﴿وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ﴾ (اور جب اس کو (یوں) آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے) کیونکہ مقدر کلام "اما الانسان اذا ماابتلاہ فقدر رزقہ" معنی ہو گا رہا انسان کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسے آزمایا تو اس کا رزق بند کر دیا

سوال: یہاں مبتدا (انسان) کو کیوں حذف کر دیا؟

جواب: تا کہ وہ اپنے قسم کے برابر ہو جائے۔

﴿فَيَقُوْلُ رَبِّيْ اَهَانَنِ﴾

(تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا) وہ اپنی نظر کے قصور اور فکر کی برائی کی وجہ سے ایسا کہتا ہے کیونکہ بسا اوقات مال کی کمی دونوں جہانون کی سعادت کی طرف لے جاتی ہے جبکہ خوش حالی تو یہ کبھی کبھی سرکشی کی طرف اور دنیا کی محبت میں منہمک ہونے کی طرف لے جاتی ہے اسی وجہ سے ان دونوں اقوال کی مذمت ارشاد فرمائی اور اپنے اس قول کے ساتھ جھڑکا ﴿كَلَّا﴾ (ایسا نہیں ہے) حالانکہ اکرمہ کے مطابق ہے، فاھانہ اور فقدرہ نہیں کہا جیا کہ اکرمہ اور نعمہ کہا ہے اس لیے کہ خوشحالی تو فضیلت ہے اور مال سے خالی کر دینا وہ اھانت نہیں ہے

امام ابن عامر شامی ،امام ابو بکر عاصم بن بهدله الکوفی ،امام حمزه بن الذیات الکوفی ،اما م علی بن حمزه الکسائی الکوفی نے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں ''ی'' بغیر سے اکرمن اھانن پڑھا ہے (جیسا کہ متن میں ہے)

امام ابو عمرو بن العلا البصری سے بھی اسی کی مثل مروی ھے اور امام نافع مدنی نے وقف میں موافقت اور وصل میں ی کے ساتھ پڑھا ہے اور امام ابن عامر شامی نے اسے تشدید کے ساتھ فقدر پڑھا ہے

﴿بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾

(بلکہ (اس کی وجہ یہ ہے کہ) تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ تم ترغیب دیتے ہو مسکین کو کھانا کھلانے کی) بلکہ ان کا فعل ان کے قول سے برا ہے اور ان کی مال کے بارے میں حرص پر زیادہ دلالت کرنے والا ہے اور وہ فعل یہ ہے کہ وہ عدم موجودگی میں یاد کرنے اور حد یہ پیش کرنے کے ساتھ یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے گھر والوں کو مسکین کو کھانا کھلانے پر برانگیختہ کرتے ہیں چہ جائیکہ کہ اپنے اہل وعیال کے علاوہ کسی اور کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیں اور امام ابو بکر عاصم بن بهدله الکوفی ،امام حمزه بن الذیات الکوفی ،اما م علی بن حمزه الکسائی الکوفی نے اسے لاتحاضون پڑھا ہے

﴿وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ﴾

(اور چٹ کر جاتے ہو میراث کا) التراث کا ترجمہ میراث ہے اور اس کی اصل وارث ہے

﴿اَكْلًا لَّمًّا﴾

(سارا مال) لما کا معنی ذالم ہے یعنی ایسا میراث کا مال کھا جاتے ہیں جو حلال و حرام سب کو جمع کرنے والا ہے اس طلیے کہ وہ عورتوں اور بچوں کو وارث نہیں بناتے تھے اور ان کا حصہ کھا جاتے تھے یا پھر جانتے ہوئے بھی ہر وہ شے کھا جاتے جو مرنے والا حلال و حرام میں سے جمع کرتا تھا

﴿وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾

(اور دولت سے حد درجہ محبت کرتے ہو) یعنی بہت زیادہ محبت کرتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ لالچ اور حد درجہ کا میلان بھی ہے امام ابو عمرو بن العلا البصری ،سهل اور امام یعقوب حضرمی بصری نے لا یکرمون سے یحبون تک تمام افعال کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی حضرات نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے

﴿كَلَّا﴾

(یقیناً) انھیں اس فعل یعنی مال کی محبت پر جھڑ کا جا رہا ہے اور ان کے طرز عمل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مابعد والا فرمان اس کی وعید پر دلالت کر رہا ہے (یعنی اگر وہ انہی کاموں میں رہے تو انہیں مابعد اشیاء کا سامنا کرنا پڑے گا)

﴿اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾

(جب زمین کو کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا) اسے ٹکرایا جائے گا یہاں تک کہ زمین پہاڑوں اور ٹیلوں والی ہو جائے گی، یا ہوا میں موجود چھوٹے

چھوٹے ذرات بن جائے گی

﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ﴾

(اور جب آپ کا رب) جب اس کی قدرت کی نشانیاں اور قہر کے آثار ظاہر ہونگے،

(یہاں استعارہ تمثیلیہ ہے) تمثیل بیان کی جارہی ہے ایک منظر کی دوسرے منظر کے ساتھ جو بادشاہوں کے حاضر ہونے کے وقت ان کی ھیبت وسیاست سے ظاہر ہوتا ہے۔

﴿وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾

(جلوہ فرما ہوگا اور فرشتے قطار در قطار حاضر ہوں گے) جو بھی کسی کا مقام ومرتبہ ہوگا اس کے مطابق

﴿وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍم بِجَهَنَّمَ﴾

(اور (سامنے) لائی جائے گی اس دن جہنم)

یہاں حقیقی معنی مراد نہیں ہے بلکہ مجازی معنی مراد ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جھنم کو ظاہر کر دیا جائے گا۔ اور حدیث میں ہے کہ جہنم کو لایا جائے گا اور اس کی ستر ہزار لگامیں ہونگی اور ہر لگام کے ساتھ ستر ہزرار فرشتے ہونگے جو اسے کھینچ رہے ہونگے"

(وفی الحدیث) سے اس جانب اشارہ ہے کہ اس کا حقیقی معنی ہی مراد ہے

﴿يَوْمَئِذٍ﴾

(اس دن) یہ اذا دکت الارض دکا دکا سے بدل ہے اور ان میں (مبدل منہ اور بدل) عامل اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ﴾ (اس روز انسان کو سمجھ آئے گی) امام بیضاوی اس جگہ اس کی دو تاویلیں کر رہے ہیں اول یہ کہ انسان اس دن نافرمانی کو یاد کرے گا یا نصیحت حاصل کرے گا یعنی اسے اعمال کی قباحت کا علم ہو جائے گا اور اس پر شرمندہ ہوگا

﴿وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى﴾

(لیکن اس سمجھنے کا کیا فائدہ؟) نصیحت کی منفعت تاکہ ماقبل کلام سے تناقض نہ ہو اور اس آیت سے توبہ کے قبول کرنے کے واجب نہ ہونے پر استدلال کیا گیا ہے اس لیے کہ اس کا گناہوں کو یاد کرنا ایسی توبہ ہے جو مقبول نہیں

(امام بیضاوی معتزلہ کا رد فرما رہے ہیں کیونکہ معتزلہ کا مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بندہ کی توبہ قبول کرنا واجب ہے)

﴿يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ﴾

((اس دن) کہے گا کاش! میں نے (کچھ) آگے بھیجا ہوتا اپنی (اس) زندگی کے لیے) اس زندگی کے لیے یا دنیا میں زندگی کے وقت نیک اعمال بھیجے ہوتے اور اس تمنا میں آدمی کے اپنے فعل کے مستقل ہونے پر کوئی دلالت موجود نہیں ہے کیونکہ بسا اوقات کسی چیز سے روکا گیا بندہ تمنا کرتا ہے کہ اگر اس کے لیے ایسا کرنا ممکن ہوتا تو وہ کر گزرتا

(یہاں بھی امام بیضاوی معتزلہ کا رد فرما رہے ہیں آئمہ معتزلہ کا کہنا ہے کہ بندے اپنے افعال وشر کا خود خالق ہے جو اھل سنت نزدیک درست نہیں)

﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ﴾

(پس اس دن اللہ کے عذاب کی طرح نہ کوئی عذاب دے سکے گا اور نہ اس کے باندھنے کی طرح کوئی باندھ سکے گا)

"ہ" ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی قید کا کوئی بھی والی نہیں ہوگا کیونکہ تمام کا تمام امر اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگا یا "ہ" ضمیر انسان کی طرف راجع ہے معنی ہوگا قیامت کے دن درغوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا عذاب نہیں دے رہا ہوگا جو ان کی مثل اسے دے رہیں ہونگے اور امام علی بن حمزہ الکسائی الکوفی، امام یعقوب حضرمی بصری نے ان دونوں افعال کو مجہول پڑھا ہے

﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾

(اے نفس مطمئن !) قول کے ارادہ پر اور نفس مطمئنہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مطمئن ہوتا ہے اور واجب لذاتہ کے اسباب ومسببات کے سلسلہ میں ترقی کرتا ہے وہ اس کی معرفت کے ساتھ اقرار حاصل کرتا ہے اور اس کیساتھ اس کے غیر سے مستغنی ہو جاتا ہے

یا پھر نفس حق کی طرف اس حیثیت سے ترقی کرتا ہے کہ کوئی شک اسے مضطرب نہیں کر سکتا

یا نفس مطمئنہ سے مراد ایسا امن والا نفس مراد ہے جسے کوئی خوف اور غم پریشان نہیں کرتا اور اسے اس کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے (النفس الامنة)

﴿ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ﴾

(واپس چلو اپنے رب کی طرف) اپنے رب کے امر کی طرف لوٹ آؤ یا اس کے وعدے کی طرف لوٹ آؤ

اور یہ آیت اس آدمی کے قول کا شعور دلاتی ہے جس نے کہا کہ نفوس ابدان سے پہلے عالم قدس میں موجود تھے

یا بعث کے ذریعے اپنے رب کی طرف لوٹ آؤ (دوبارہ زندہ کیا جانا بعث کہلاتا ہے)

﴿رَاضِيَةً﴾

(اس حال میں کہ (تو اس سے) راضی) اس کے ساتھ جو تجھے عطا کیا گیا ہے

﴿مَّرْضِيَّةً﴾

((اور) وہ تجھ سے راضی) اللہ تعالیٰ کے نزدیک

﴿فَادْخُلِي فِي عِبَادِي﴾

(پس شامل ہو جاؤ میرے خاص بندوں میں) میرے نیک بندوں کے گروہ میں

﴿وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾

(اور داخل ہو جاؤ میری جنت میں) ان نیک بندوں کے ساتھ یا پھر مقربین کے زمرہ میں (شامل ہو جاؤ) اور ان کے نور سے ضیاء حاصل کرو، جواہر قدسیہ آمنے سامنے پڑے ہوئے شیشوں کی مانند ہیں یا میرے بندوں کے جسمون میں داخل ہو جاو جن سے جدا ہوئے تھے اور میرے دار ثواب میں داخل ہو جاو تمہارے لیے تیار کیا گیا ہے

سورۃ نمبر 14	سورہ البلد	بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	کل آیات 20

﴿لَا أُقْسِمُ بِهَٰذَا الْبَلَدِ وَأَنتَ حِلٌّ م بِهَٰذَا الْبَلَدِ﴾

(میں قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی دراں حالیکہ آپ بس رہے ہیں اس شہر میں) اللہ تعالیٰ نے حرمت والے شہر کی قسم اٹھائی ہے اور اسے حضور ﷺ کے اس شہر میں قیام پذیر ہونے کے ساتھ مقید فرمایا ہے حضور ﷺ کی مزید فضیلت کا اظہار کرنے کے لئے اور اس چیز کا شعور دلانے کے لئے کہ کسی جگہ کی عزت (شرف) اس کے اھل کی عزت (شرف) کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حلال سمجھنے والے نے اس جگہ آپ سے اعراض کرنے کو حلال جانا ہے جس طرح کہ اس نے دوسرے مقامات میں شکار کو حلال جانا ہے یا (اس کا معنی یہ ہے) آپ ﷺ حرم میں جس کام کا ارادہ رکھتے ہیں وہ دن کے کچھ حصہ میں سر انجام دے لیں۔ اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے دن آپ سے فرمایا تھا

﴿وَوَالِدٍ﴾

(اور قسم کھاتا ہوں باپ کی) اس کا ھذا البلد پر عطف ہے اور والد سے مراد حضرت آدم یا حضرت ابراھیم علیھما الصلاۃ والسلام مراد ہیں

﴿وَمَا وَلَدَ﴾

(اور اولاد کی) (اس سے) حضرت آدم کی اولاد یا نبی کریم ﷺ (مراد ہیں) جب ''والد'' سے مراد (اولاد آدم) ہوگی اور جب ''والد'' سے مراد

حضرت ابراھیم علیہ السلام ہوں گے تو ''وما ولد'' سے مراد حضرت محمد ﷺ ہوں گے۔

سوال: ''ما'' تو غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے جبکہ ''من'' ذوی العقول کے لئے آتا ہے تو یوں عبارت ہوگی ''ووالد و ما ولد'' جبکہ من کی جگہ ما کو رکھا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: والد کو نکرہ ذکر کرنا تعظیم کی وجہ سے ہے اور ما کو من پر ترجیح دینا اظہار تعجب کے لیے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے سو اللہ اعلم بما وضعت

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ﴾

(بے شک ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں (زندگی بسر کرنے کے لیے) پیدا کیا ہے) امام صاحب نے کبد کا معنی تعجب (تھکاوٹ) اور مشقت کیا ہے اور یہ کبد الرجل کبدا سے ماخوذ ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب آدمی کے میں درد ہو اور اسی سے لفظ ''المکابدۃ'' ماخوذ ہے (جس کا معنی تکلیف ہے) انسان مسلسل مصائب و مشکلات میں زندگی بسر کرتا ہے، زندگی کا آغاز رحم کی تنگی اور تاریکی سے ہوتا ہے اور اس کی انتہا موت اور اس کے بعد کے حالات پر ہوتی ہے، اور یہ نبی کریم ﷺ کو ان اشیاء و افعال پر تسلی دینا ہے جو آپ ﷺ قریش والیوں سے برداشت کیا کرتے تھے اور ﴿اَیَحْسَبُ﴾ (کیا وہ خیال کرتا ہے) میں ضمیر کے بارے میں مندرجہ ذیل احتمالات ہیں

پہلا مرجع: اس کی طرف لوٹ رہی ہے کہ جس کی جانب سے حضور ﷺ نے سب سے زیادہ تکالیف برداشت فرمائی۔

دوسرا مرجع: جو اپنی قوت کی وجہ سے دھوکہ میں مبتلا تھا جیسے ابی الاشد بن کلدۃ اس کے قدموں کے نیچے عکاظی چمڑا بچھایا جاتا تھا اور دس لوگ مل کر اسے کھینچتے تھے چمڑا (تو) کٹ جاتا تھا مگر اس کے پاؤں نہیں ڈگمگاتے تھے

تیسرا مرجع: یا ایحسب کی ضمیر کفار میں سے ہر وہ شخص جو تکلیف پہنچاتا تھا اس کی طرف لوٹ رہی ہے۔

چوتھا مرجع: یا ایحسب کی ضمیر انسان کی طرف راجع ہے۔

﴿اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ﴾

(کہ اس پر کسی کا بس نہیں چلے گا) کہ اس سے انتقام لے سکے

﴿یَقُوْلُ﴾

(کہتا ہے) یعنی اس وقت کہے گا

﴿اَهْلَکْتُ مَالًا لُّبَدًا﴾

(میں نے ڈھیروں مال فنا کر دیا) لُبَدًا کا معنی کثیر (بہت زیادہ) ہے اور معنی یہ ہوگا کہ میں نے بہت زیادہ مال ہلاک کیا اور یہ تلبد الشیء سے ماخوذ ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی چیز جمع ہو جاء یا اس سے مراد وہ مال ہے جو اس نے شہرت اور فخر کرتے ہوئے خرچ کیا یا اس سے مراد وہ مال ہے جو اس نے نبی کریم ﷺ سے دشمنی کرتے ہوئے خرچ کیا (سمعۃ)

﴿اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗۤ اَحَدٌ﴾

(کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا) جب وہ خرچ کرتا تھا یا اس کے بعد اس سے سوال کرے گا یعنی اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے پس وہ اسے اس کی جزاء دے گا یا کیا وہ گمان کرتا ہے کہ اسے کسی نے بھی یہ فعل کرتے ہوئے نہیں دیکھا تا کہ وہ اس کا محاسبہ کرے اور اپنے اس ارشاد کے ساتھ اس بات کو مزید پختہ کیا ﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ﴾ (کیا ہم نے نہیں بنائیں اس کے لیے دو آنکھیں) جن دونوں کے ساتھ وہ دیکھتا ہے ﴿وَلِسَانًا﴾ (اور ایک زبان) جس کے ساتھ اپنی پوشیدہ باتوں کی ترجمانی کرتا ہے ﴿وَّشَفَتَیْنِ﴾ (اور دو ہونٹ) جن کے ذریعے اپنے منہ کو چھپاتا ہے سا وران کے ذریعے کھانے پینے، گفتگو کرنے اور اس کے علاوہ دوسرے امور میں مدد حاصل کرتا ہے ﴿وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ﴾ (اور ہم نے دیکھا دیے اسے دو نمایاں راہیں) خیر و شر کے دو راستوں کی جانب یا پستان کی طرف اور نجد بلند جگہ کو کہتے ہیں

﴿فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَۃَ﴾

(پھر وہ داخل ہی نہیں ہوا (عملِ خیر کی دشوار) گھاٹی میں) عقبہ میں داخل ہو کر ان احسانات کا شکر ادا نہیں کیا اور عقبہ میں دخول سے مراد سخت، مشکل امر میں داخل ہونا ہے اور عقبہ اس راستے کو کہتے ہیں جو پہاڑ کے اندر ہوتا ہے اور فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَۃَ کو اس چیز کے ساتھ مستعار لیا گیا ہے جس کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی گی ہے یعنی فک اور الاطعام

﴿وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَۃُ فَكُّ رَقَبَۃٍ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ اَوۡ مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَۃٍ﴾

(اور کیا آپ سمجھے کہ وہ گھاٹی کیا ہے وہ غلامی سے گردن چھڑانا ہے یا کھانا کھلانا ہے بھوک کے دن (قحط سالی) یتیم کو جو رشتہ دار ہے یا خاک نشین مسکین کو) اس لیے ان دو امور میں نفس کے ساتھ مجاہدہ کرنا پڑتا ہے

سوال: جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ لا حرف نفی فعل مضارع پر داخل ہوتا ہے اور اگر لا سے فعل ماضی کی نفی کرنا مقصود ہو تو دوسرے فعل ماضی کے ساتھ اس کا تکرار ضروری ہوتا ہے جیسا کہ لاصدق ولاصلی میں ہے جبکہ اس جگہ فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَۃَ میں دوسرے فعل ماضی کے ساتھ تکرار نہیں کیا گیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: مراد کے متعدد ہونے کی وجہ سے لم کی جگہ لا کو ذکر کرنا زیادہ اچھا ہے اس لیے کہ لا ماضی پر داخل نہیں ہوتا مگر جب فعل مکرر ہو جبکہ اس جگہ اقتحم کا معنی لا فك ولا اطعم يتيما اور مسكينا ہے (یعنی نہ اس نے غلام آزاد کیا اور نہ ہی یتیم یا مسکین کو کھانا کھلایا) اور مسغب، سغب اور متربہ (تمام) مَفۡعَلَۃ کے وزن پر ہیں (مصادر میمی ہیں)

مسغبه ، سغب سے مشتق ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی سخت بھوکا ہو اور مقربة قرب فى النسب سے مشتق ہے (یعنی نسب کے اعتبار سے قریب ہونا) اور متربة ترب سے ماخوذ ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی آدمی فقیر ہو جائے

ابن كثير مكى ،امام ابو عمرو بن العلا البصرى اور اما م على بن حمزه الكسائى الكوفى نے اسے اقتحم سے بدل بناتے ہوئے فک رقبۃ اور اطعم پڑھا ہے

اور اللہ تعالی کا فرمان (وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَۃُ) جملہ معترضہ ہے اس صورت میں معنہ ہوگا کہ آپ اس وقبہ کی صعوبت اور اس پر مرتب ہونے والے ثواب کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے

﴿ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾

(پھر وہ ایمان والوں سے ہو) ایمان کے مستقل ہونے اور باقی تمام اطاعتیں اس کے ساتھ مشروط ہونے کی وجہ سے رتبہ میں کھانا کھلانے اور غلام کو آزاد کرنے سے تباعد ایمان کی وجہ سے اس جملہ کا اقتحم / فک پر ثم کے ذریعہ عطف ہے

﴿وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ﴾

(اور جو ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں صبر کی) یعنی ان میں سے بعض بعضوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کی تلقین کرتے رہے

﴿وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَۃِ﴾

(اور ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں رحمت کی) یعنہ ایک دوسرے کو اللہ تعالی کے بندوں پر رحم کرنے کی وصیت نکرتے رہے یا پھر ان امور کی وصیت کرتے رہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سبب ہیں

﴿اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَۃِ﴾

(یہی لوگ دائیں حاتھ والے ہیں) یعنی دائیں ہاتھ والے/ یا پھر یہی وہ لوگ ہیں جو برکت والے ہیں

﴿وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا﴾

(اور جنہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا) یعنی ان اشیاء کا انکار کرتے ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حجت سے حق پر دلیل بنایا

یا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کریم کا انکار کیا

﴿هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ﴾

(وہ لوگ بائیں ہاتھ والے ہیں) یعنی بائیں ہاتھ والے/ یا پھر یہی وہ لوگ ہیں جو بدبخت ہیں

سوال مؤمنین کے ذکر کو اسم اشارہ کے ساتھ مکرر کرنا اور کفار کا ذکر ضمیر کے ساتھ کرنے میں کیا حکمت عملی ہے؟

جواب مؤمنین کے ذکر کو اسم اشارہ کے ساتھ مکرر کرنا اور کفار کا ذکر ضمیر کے ساتھ کرنے میں ایسی شان ہے جو کسی سے مخفی نہیں ہے (مؤمنین اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونگے جبکہ کفار غائب ہونگے)

﴿عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ﴾

(ان پر آگ چھائی ہوگی) یعنی ان پر آگ تہہ در تہہ ہوگی اور یہ او صدت الباب سے مشتق ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب آپ ایک کواڑ کو دوسرے کواڑ پر رکھ کر اسے بند کردے

امام ابو عمرو بن العلا البصری ،امام حمزہ بن الذیات الکوفی اور امام حفص نے اسے ہمزہ کے ساتھ مؤصدۃ پڑھا ہے اور اس صورت میں یہ آصدتہ سے مشتق ہوگا

سورۃ نمبر 14	سورہ الشمس	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	کل آیات 15

﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا﴾

(قسم ہے آفتاب کی اور اس کی دھوپ کی)

ضحٰھا کا ترجمہ کر رہے ہیں کہ اس کی روشنی کی قسم ہے جب وہ خوب روشن ہو اور کہا گیا ہے کہ الضحوۃ سے مراد دن کا بلند ہونا ہے اور الضحی سے مراد اس سے تھوڑا زیادہ وقت ہے اور الضحاء ض کے فتحہ اور الف مدہ کے ساتھ اس کا معنی ہے جب دن خوب پھیل جاتا اور نصف تک جا پہنچے۔

﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا﴾

(قسم ہے مہتاب کی جب وہ غروب آفتاب کے بعد آوے)

اور چاند کی قسم جب وہ اس کے پیچھے چلے یعنی جب چاند کا طلوع ہونا سورج کے طلوع ہونے کے پیچھے آئے مہینے کے شروع میں یا چاند کا طلوع ہونا سورج کے غروب ہونے کے پیچھے آتا ہے چودھویں رات یا چاند کا طلوع ہونا چکر لگانے میں اور نور کے مکمل ہونے میں سورج کے پیچھے پیچھے ہے۔

﴿وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا﴾

(اور قسم ہے دن کی جب وہ آفتاب کو روشن کردے) اور دن کی قسم جب اسے روشن کردے جب دن سورج کو روشن کردے اس لئے کہ سورج اس وقت روشن ہوتا ہے جب دن پھیلتا ہے یا جب دن تاریکی یا دنیا باز میں کو روشن کرتا ہے ان اشیاء کا مراد لینا درست ہے اگر چہ ان کا ذلر اس سے قبل نہیں گزرا ان کے بارے میں علم ہونے کی وجہ سے۔

﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا﴾

(اور رات کی جب وہ اسے چھپالے) یعنی سورج پر چھا جائے اور اس کی روشنی کو ڈھانپ لے یا جب رات آفاق یا زمین کو ڈھانپ۔

سوال: الشمس تو واو قسمیہ جارہ کی وجہ سے مجرور ہے لیکن اللیل اور النھار تو ظرف ہیں اور ان سے پہلے واو عاطفہ ہے نہ کہ واو قسمیہ جارہ پھر ان کو مجرور پڑھنا کس اعتبار سے درست ہوگا؟

جواب: جب تمام واو عطف اس واو قسمیہ اولی کے قائم مقام ہیں، جارہ بذات خود فعل قسم ک قائم مقام ہے اس حثیت سے کہ واو قسم کے ذکر کرنے سے فعل قسم کا

حذف کرنا لازم ہو جاتا ہے تو اس نے تمام مجرورات اور ظرف کو ماقبل مجرور ظرف سے ملا دیا ہے واو نے مابعد کو ماقبل کے ساتھ حکم میں ملانے کی مثال تیرے قول میں ضرب زید عمرا اور خالد بکر، فاعل اور مفعول پر عطف میں دو مختلف عاملوں پر عطف کیے بغیر۔

﴿وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا﴾

(ور قسم ہے اسے بنانے والے کی) اور جس نے اسے بنایا یعنی جس نے اسے بنایا ہے من کی جگہ ما کو ترجیح دی گئی ہے معنی وقضیہ کا ارادہ کرتے ہوئے گویا کہ کہا گیا ہے کہ اس شئی قادر کی قسم جس نے اسے بنایا، آسمان اللہ کے وجود اور اس کی کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے اسی وجہ سے اس کا ذکر مقرر (الگ) طور پر خصوصیت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ اور اسی طرح کا کلام اللہ کے اس فرمان میں ہے کہ ﴿وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا﴾

(اور قسم ہے زمین کی اور اس کو بچھانے والے کی، قسم ہے نفس کی اور اس کو درست کرنے والے کی) اور کتنے مابین جن کو مصدر یہ بنایا فعل کو فاعل سے الگ کر دیتا ہے اور اللہ کے ارشاد ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا﴾

(پھر اس کے دل ڈال دیا اس کی نافرمانی اور اس کی پارسائی کو) کے ساتھ تعلق میں خلل ڈالتا ہے مگر جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسم جلالت کو مضمر جانا جائے تو اس صورت میں یہ تعبیر ہو سکتی ہے۔ پس اس کے دل میں ڈال دیا اس کی نافرمانی کو اور اس کی پادرسائی کو کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس بات کا علم ہونے کی وجہ سے کہ تمام اشیاء کا پیدا کرنے والا وہی ہے نفس کو نکرہ ذکر کرنا کہ کثرت کو بیان کرنا کے لئے ہے جیسے اللہ کے ارشاد علمت نفس ماقدمت واخرتمیں نفس نکرہ ہے اور کلام مثبت میں کثرت پر دلالت کر رہا ہے یا پھر تعظیم کے لئے نکرہ ذکر کیا گیا ہے کہ اور اس سے مراد نفس آدم ہے فجور اور تقوی کا الہام کرنا ان دونوں کا سمجھا دینا ان کی حالت بیان کرنا اور ان دونوں کے بجالانے پر قدرت عطا کرنا ہے۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾

(یقیناً فلاح پایا جس نے (اپنے) نفس کو پاک کر لیا) تحقیق فلاح پا گیا ہے وہ جس نے اس کا تزکیہ کیا یعنی اس نفس کو علم وعمل کے ذریعے پروان چڑھایا ہے اور یہ جواب قسم ہے لام کو قسموں کے سلسہ میں طوالت کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے گویا کہ جب انسان کو تکمیل نفس پر ابھارنے اور اس ابھارنے میں مبالغہ کرنے والے کا ارادہ کیا تو ان اشیاء پر قسم اٹھائی جو مانع کے موجود ہونے اس کی واجب الوجود ہونے اور صفات میں کامل ہونے کے علم کی طرف انسانوں کی رہنمائی ہے اور اپنی عظیم نعمتوں کو یاد دلایا تا کہ یہ امر انہیں اللہ کے شکر کو بجالانے میں مستغرق ہونے پر برانگیختہ کرے اور پس قوت عملیہ کے کمالات کی ابتداء ہے اور قول یہ بھی ہے کہ قد افلح من تزکی جواب قسم نہیں بلکہ استطر اد ہے (اور استطر اد یہ ہے کہ کلام ایسے طریقے سے لایا جاتا ہے کہ اس سے ایک اور کلام واضح ہو اور ذہن دوسرے کلام کی طرف منتقل ہو جائے) نفس کے بعض احوال کو ذکر کرنے کے ساتھ اور جواب قسم محذوف ہے جواب قسم مقدرہ لیدمدمن اللہ علی کنار مکۃ لکذیب رسولہ ہوگا یعنی اللہ اپنے رسول ﷺ کی تکذیب کرنے کی وجہ سے کفار کو ضرور ھلاک کرے گا جیسے قوم ثمود کو صالح علیہ السلام کی تکذیب کرنے کی وجہ سے ھلاک کیا۔

﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾

(اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں دبا دیا) اور تحقیق وہ خائب وخاسر ہوا جس نے اسے پامال کیا یعنی اس میں نقص پیدا کیا اعور جس نے اسے چھپایا جہالت کی وجہ سے اور فسق اپنا کر دسٰی کی اصل دسس ہے (باب تفیل سے ماضی ہے) جیسے تقضی اصل میں تقضض تھا۔

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ﴾

(جھٹلایا قوم ثمود نے (اپنے پیغمبر کو) اپنی سرکشی کے باعث) اور قوم ثمود نے جھٹلایا اپنی سرکشی کے باعث اپنی سرکشی کے سبب سے یا اس عذاب کو جھٹلایا جس کی انہیں دھکی دی گی ایسا عذاب جو حد سے تجاوز کرنے والا تھا جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے انہیں چنگھاڑ کے ذریعے ھلاک کر دیا گیا اور اس کی اصل طغیا ھا ہے یا کو واو سے بدلا تا کہ فعلی اسمی اور صفتی کے درمیان فرق واضح ہو جائے اور اس کو ضمہ کے ساتھ طغیا ھا بھی پڑھا گیا ہے جیسے الرجعی کو دونوں اعراب سے پڑھا گیا ہے جیسے الرجعی کو دونوں اعراب سے پڑھا گیا ہے۔

﴿اِذِ انۡبَعَثَ﴾

(جب اٹھ کھڑا ہوا) جب وہ اٹھ کھڑا ہوا انبعث کا ترجمہ قام کیا ہے یعنی جب کھڑا ہوا یہ کذبت یا طغوی کے لئے ظرف ہے۔

﴿اَشۡقٰهَا﴾

(ان میں سے بڑا بد بخت) ان میں سے بد بخت ترین یعنی قوم ثمود میں سے بد بخت ترین اور وہ قدار بن سالف اور اس کی مدد کرنے والا شخص ہے جس نے اونٹنی کو قتل کرنے کے لئے اس کی مدد کی، افعل التفضیل کو جب مضاف کیا جائے تو یہ واحد اور جمع سب کے لئے درست ہوتا ہے ان کی شقاوت کی فضیلت ان کے اونٹنی کی کوچیں کاٹنے کی وجہ سے تھی۔

﴿فَقَالَ لَهُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ﴾

(تو کہا انہیں اللہ کے رسول نے کہ (خبردار رہنا) اللہ کی اونٹنی) پس اللہ کے رسول نے ان سے کہا کہ اللہ کی اونٹنی ہے یعنی اللہ کی اونٹنی کو چھوڑ دو اور اس کی کونچیں کاٹنے سے ڈرو

﴿وَسُقۡيٰهَا﴾

(اور اس کی پانی کی باری سے) اسے پانی سے دور نہ بھگاؤ

﴿فَكَذَّبُوۡهُ﴾

(پھر بھی انہوں نے جھٹلایا رسول کو) اس کی جھٹلایا اس بات میں اللہ کہ رسول کو جھٹلایا جس کے بارے میں رسول نے انہیں ڈرایا عذاب کے واقع ہونے سے اگر دن اس فعل کا ارتکاب کریں۔

﴿فَعَقَرُوۡهَا فَدَمۡدَمَ عَلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ﴾

(اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں پس ہلاک کر دیا انہیں ان کے رب نے) پس انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں اللہ نے ان پر نازل کیا ہے یعنی اللہ نے ان پر عذاب بند کر دیا اور عدم ایسا فعل ہے جس میں تکرار ہے عربوں کے قول ناقۃ مدمومۃ سے ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب اونٹنی پر بہت زیادہ چربی آجائے

﴿بِذَنۡۢبِهِمۡ﴾

(ان کے گناہِ عظیم کے باعث) ان کے گناہوں کے سبب اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ باء سببیہ ہے۔

﴿فَسَوّٰٮهَا﴾

(اور سب کو پیوندِ خاک کر دیا) برابر کر دیا ان پر یعنی ان کے درمیان ھلاکت کو برابر کر دیا یا ان پر عذاب کو برابر کر دیا پس ان میں کوئی بھی چھوٹا بڑا نہ بچایا پھر قوم ثمود کو ھلاک کرنے میں برابر کر دیا

﴿وَلَا يَخَافُ عُقۡبٰهَا﴾

(اور کوئی ڈر نہیں اللہ کو ان کے (تباہ کن) انجام کا)

(یعنی اللہ کو ان پر عذاب مسلط کرنے سے کوئی ڈر نہیں یا اللہ قوم ثمود کو ھلاک کرنے سے نہیں ڈرتا اور ان کے پیروکاروں کو ھلاک کرنے سے نہیں ڈراتا پس اگر ڈرتا تو ان سے کچھ کو باقی رکھتا اور ولد حال کے لئے ہے اور نافع اور ابن عامر نے اس جگہ "فلا یخاف" پڑھا ہے عطف کرتے ہوئے۔

سورۃ نمبر 15	سورہ الیل	بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	کل آیات 21

﴿وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی﴾

(قسم ہے رات کی جب وہ (ہر چیز پر) چھا جائے) یعنی جب رات سورج پر چھا جائے یا دن پر چھا جائے یا رات اپنی تاریکی میں چھپائے اس پر چھا جاتی ہے

﴿وَالنَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی﴾

(اور قسم ہے دن کی جب وہ خوب چمک اُٹھے)

یعنی رات کی تاریکی ہونے کے ساتھ ظاہر ہو جائے یا سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ دن ظاہر ہو جائے۔

﴿وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰی﴾

(اور اس کی قسم جس نے پیدا کیا نر اور مادہ کو) اس قادر کی قسم جس نے مذکر و مؤنث دونوں صفتوں کو ذکر کیا (پیدا کیا) ہر اس نوع سے جس سے تولید کا سلسلہ (عمل) جاری ہے یا پھر الذکر سے مراد آدم اور انثی سے مراد حوا علیہ السلام ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ما مصدر یہ ہے۔

﴿اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی﴾

(بے شک تمہاری کوشش مختلف نوعیت کی ہیں) بے شک تمہاری کاوشیں مختلف اسباب کے لئے ہیں اور شتی شویت کی جمع ہے۔

﴿فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی﴾

(پھر جس نے (راہ خدا میں اپنا) مال دیا اور (اس سے) ڈرتا رہا اور جس نے اچھی بات کی تصدیق) یہ کوششوں کے اختلاف کو بیان کرنے کی تفصیل ہے معنی یہ ہوگا کہ جس نے اطاعت کی اور معصیت سے بچا اور کلمہ حسنی کی تصدیق کی اور کلمہ حسنی سے مراد ہر وہ بات ہے جو کلمہ توحید پر دلالت کرتی ہے۔

﴿فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡیُسۡرٰی﴾

(تو ہم نے آسان کر دیں گے اس کے لیے آسان راہ) ہم اس کے لئے تیار کریں گے ایسا راستہ جو آسانی راحت کی طرف لے جائے جس طرح کہ جنت میں داخل ہونا اور یہ یسر الفرس سے ماخوذ ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب اسے زین لگام ڈالنے کے ذریعے سواری کے لئے جب گھوڑے کو زین اور لگام کے ساتھ سواری کے لئے تیار کہا جاتا ہے۔

﴿وَاَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ﴾

(اور جس نے بخل کیا) جن کاموں کا اسے حکم دیا گیا تھا۔

﴿وَاسۡتَغۡنٰی﴾

(اور بے پرواہ بنا رہا) آخرت کا انجام کی نعمتوں سے اعراض کرتے ہوئے دنیا کی شہوات کے ساتھ بے پرواہ بنا رہا ہے۔

﴿وَکَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی﴾

(اور اچھی بات کو جھٹلایا) اچھے کاموں پر دلالت کرنے والی چیزوں کے انکار کے ساتھ۔

﴿فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡعُسۡرٰی﴾

(تو ہم آسان کر دیں گے اس کے لیے مشکل راہ) جو تنگی اور شدت کی طرف لے جانے والا ہے جیسے جہنم میں داخل ہونا

﴿وَمَا یُغۡنِیۡ عَنۡہُ مَالُہٗۤ﴾

(اور اس کے کسی کام نہ آئے گا اس کا مال) ما نافیہ ہے یا استفہام انکاری ہے۔

﴿اِذَا تَرَدّٰی﴾

(جب وہ ہلاکت (کے گڑھے) میں گرے گا) ہلاک ہوگا تردی کا ترجمہ ھلک کیا ہے ہلاک ہوگا اور یہ ردی سے باب تفعل ہے یا پھر معنی ہوگا کہ وہ قبر

کے گڑھے میں گرے گا یا جہنم کی گہرائی میں گرے گا۔

﴿اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى﴾

(بے شک ہمارے ذمہ (کرم پر) ہے رہنمائی کرنا) حق کی طرف راہنمائی کرنا ہمارے ذمے ہے ہمارے اپنے فیصلہ کے مطابق یا ہماری حکمت کے تقاضے کے مطابق یا ہمارے ذمہ کرم پر ہے ھدایت کے راستے کی طرف راہنمائی کرنا جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے "وعلی اللہ قصد السبیل" (اور اللہ تعالیٰ ہی کے ذمہ ہے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرنا۔

﴿وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى﴾

(یقیناً آخرت اور دنیا کے ہم ہی مالک ہیں) پس ہم دارین میں جو چاہیں گے جسے چاہیں گے عطا کریں گے یا ہم ہی ہدایت یافتہ کو ھدایت کا ثواب عطا کرتے ہیں یا مراد یہ ہے کہ تمہارا ہدایت کو ترک کرنا ہمیں کوئی نقصان نہیں دیتا۔

﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى﴾

(پس میں نے خبردار کر دیا ہے تمہیں ایک بھڑکتی آگ سے) شعلہ زن آگ سے۔

﴿لَا يَصْلٰهَآ﴾

(اس میں نہیں جلے گا) سختیوں کو برداشت کرنا اسے لازم نہیں پکڑے گا۔

﴿اِلَّا الْاَشْقَى﴾

(مگر وہ انتہائی بدبخت) مگر کافر کیونکہ فاسق اگر چہ اس میں داخل ہو گا لیکن اس نار جھنم کو تاپنا ہمیشہ کے لئے لازم نہ ہو گا اسی وجہ سے کافر کا نام اشقی رکھا گیا ہے اور اس قول کے ذریعے اس کی صفت بیان فرمائی۔

﴿الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى﴾

(جس نے (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کو جھٹلایا اور (آپ سے) روگردانی کی) جس نے تکذیب کی اور روگردانی کی یعنی حق کو جھٹلایا اور اطاعت سے منہ پھیر دیا

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى﴾

(اور دور رکھا جائے گا اس سے وہ نہایت پرہیزگار) یعنی جو شرک اور گناہوں سے بچتا رہا ہے اس لئے کہ وہ اس میں داخل نہ ہو گا چہ جائے کہ اس میں داخل ہو اور پھر اس میں ہمیشہ رہے یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو آدمی شرک سے بچا نافرمانی کے علاوہ تو اسے جہنم سے دور تو نہ رکھا جائے گا اور نہ ہی اس میں ہمیشہ رہنا لازم آئے گا اور یہ تاویل حصر سابق کے منافی نہیں ہے۔

﴿الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ﴾

(جو دیتا ہے اپنا مال) یعنی اپنے مال کو بھلائی کے راستے میں خرچ کرتا ہے۔

سوال: یہاں تو مطلقا مال شرح کرنے کا ذکر ہے جبکہ آپ نے بھلائی کے کاموں سے اسے مقید کر دیا اس پر کیا دلیل ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے

﴿يَتَزَكّٰى﴾

(اپنے (دل کو) پاک کرنے کے لیے) تا کہ اور یہ یؤتی سے بدل ہے یا پھر یؤتی میں ھو ضمیر مستتر فاعل سے حال ہے۔

﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى﴾

(اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دینا ہو) تا کہ وہ مال کے ساتھ اس احسان کا بدلہ دینے کا قصد کرے۔

﴿اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى﴾

(بجز اس کے وہ اپنے برتر پروردگار کی خوشنودی کا طلب گار ہے) یہ مستثنیٰ منقطع یا متصل ہے کلام کے محذوف ہونے کے ساتھ جو یہ ہوگا لا "یؤتی الا ابتغاء وجه ربه الاعلی لا لمکافاۃ نعمة" وہ مال دیتا ہے اپنے برتر پروردگار کی رضا کے لئے نہ کسی کا احسان چکانے کے لئے۔

﴿وَلَسَوْفَ يَرْضٰى﴾

(اور وہ ضرور (اس سے) خوش ہوگا) اللہ اس سے ضرور راضی ہوگا یہ اس ثواب کا وعدہ کیا جا رہا ہے کہ جس کے ساتھ وہ راضی ہو جائے گا اور یہ آیت حضرت سیدنا ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس جماعت سے خریدا جن کے مالک مشرک ہیں اور انہیں آزاد کر دیا اور اسی تعبیر کی بناء پر کہا گیا ہے کہ اشقی سے مراد ابو جہل اور امیہ بن خلف ہے۔

سورۃ نمبر 16	سورہ الضحی	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	کل آیات 11

﴿وَالضُّحٰى﴾

(قسم ہے روزِ روشن کی) اس کی تخصیص اس وجہ سے ہے کہ اس میں دن قوی ہوتا ہے یا پھر اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے کلام کیا یا اس وقت جادوگر سجدہ میں گر گئے یا اس سے مراد پورا دن ہے اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا فرمان کرتا ہے " ان یاتیهم باسنا ضحی" جو کہ بیانا کے مقابلہ میں آیا ہے۔

﴿وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى﴾

(اور رات کی جب وہ سکون کے ساتھ چھا جائے) اس کے اھل پرسکون ہو جائیں یا مراد ہے رات کی تاریکی بہت گیری ہو جائے اور اس صورت میں یہ "سجا البحر سجدا" سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب سمندر کی موجیں ساکن (پرسکون) ہو جائیں۔

﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ﴾

(نہ آپکے رب نے آپ کو چھوڑ) یعنی قطع تعلق کرنے والے (الوداع کہنے والے) کی طرح ان کو نہیں چھوڑا جائے اور اسکو تخفیف کے ساتھ وودعک بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں معنی ماترکک ہوگا (یعنی آپ کو نہیں چھوڑا) اور یہ جواب قسم ہے۔

﴿وَمَا قَلٰى﴾

(اور نہ ہی ناراض ہوا) اور آپ سے بغض نہیں رکھا اور روایت کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ انشاء اللہ کو ترک کرنے کی وجہ سے وحی آپ ﷺ سے کچھ ایام کے لئے مؤخر ہوئی۔

﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى﴾

(اور یقیناً ہر آنے والی گھڑی آپ کے لیے پہلی سے (بدر جہا) بہتر ہے) بہتر ہے (امام بیضاوی علیہ الرحمہ کے نزدیک اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اور آپ کے لئے آخرت دینا سے بہتر ہے اس لئے کہ وہ باقی رہنے والی اور آلائشوں سے پاک ہے اور دنیاوی زندگی فانی اور آلائشوں سے عیب دار ہے (نقصان کی آمیزش ہے) گویا کہ جب بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں لگا تار وحی اور عزت و کرامت سے آپکا تعلق قائم رکھے گا تو وعدہ فرمایا آپ ﷺ کے لئے جو آخرت میں اس سے زیادہ اعلیٰ ہے یا آپ کے معاملہ کی انتہاء اس کی ابتداء سے اچھی ہے اس لئے کہ نبی کریم کی یہ شان ہے کہ ہر لحہ رفعت اور کمال میں بلند کی سمت محو پرواز نہیں۔

﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾

(اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے) یہ وعدہ ان اشیاء کو شامل ہے جو آپ کو عطا فرمائیں نفس کے کمال امر کے ظاہر (غالب) ہونے اور دین کے بلند ہونے میں سے اور ان چیزوں کا وعدہ ہے جو آپ کے لئے ذخیرہ کر رکھی ہیں ان میں سے جن کی حقیقت کو اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا لام ابتدائیہ ہے مبتداء مقدر ہے اس لئے خبر پر داخل کیا اور تقدیر کلام "ولانت سوف یعطیک" ہے۔

﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى﴾

(کیا اس نے نہیں پایا آپ کو یتیم پھر (اپنی آغوش رحمت میں) جگہ دی) اور یجدک وجود سے مشتق ہے اور علم کے معنی میں ہے اور یتیما اس کا مفعول ثانی ہے یا یہ مصارفہ کے معنی میں ہے اور یتیما حال ہوگا۔

﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا﴾

(اور آپ کو اپنی محبت میں خودرفتہ پایا) یعنی حکمتوں اور احکام کے علم سے ناآشنا پایا۔

﴿فَهَدٰى﴾

(تو منزل مقصود تک پہنچادیا) یعنی وحی، الہام اور نظر وفکر کی توفیق کے ساتھ آپ کو تعلیم دی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کو راستے میں بھولا ہوا پایا اس وقت جب آپ کے چچا ابو طالب شام لے گئے یا اس وقت جب حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ نے آپ کو دودھ چھڑایا اور آپ کو لے کر آئی تا کہ آپ ﷺ کو آپ کے دادا کی طرف لوٹا دیں پس آپ کی اپنے چچا اور دادا سے اجنبیت کو زائل کر دیا۔

﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا﴾

(اور اس نے آپ کو حاجت مند پایا) اہل وعیال والا پایا

فقیرا سے اس جانب اشارہ ہے کہ عائلا صفت ہے جس کا موصوف فقیرا محذوف ہے اور ذا عیال سے اس جانب اشارہ ہے کہ اسم فاعل (عائلا) نسبت کے معنی میں ہے

﴿فَاَغْنٰى﴾

(تو غنی کر دیا) پس غنی کر دیا تجارت کے مال سے حال سے حاصل ہونیوالے نفع کے ذریعے۔

﴿فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾

(پس کسی یتیم پر سختی نہ کیجیے) اس مال پر اس کے کمزور ہونے کی وجہ سے غلبہ حاصل نہ کی جائے اور فلا تکھر بھی پڑھا گیا ہے یعنی یتیم کے سامنے چہرے پر درشتگی کے آثار نہ لائیے۔

﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾

(اور جو مانگنے آئے اس کو مت جھڑ کیے) یعنی آپ اسے نہ جھڑ کیے۔

﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (اور اپنے رب کریم کی نعمتوں کا ذکر فرمایا کیجیے) اس لئے کہ نعمتوں ذکر کرنا ان کا شکر بجالانا ہی ہے اور کہا گیا ہے کہ نعمة سے مراد منصب نبوت ہے اور تحدث بھی سے مراد اس نبوت سے احکام کی تبلیغ کرنا ہے۔

سورة نمبر 17	سورہ الانشراح	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	کل آیات 8

﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾

(کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کر دیا) کیا ہم نے آپ کے سینے کو وسعت نہیں عطا نہیں کی یہاں تک کہ اس کے اندر بیک وقت حق تعالی سے مناجات کرنے اور مخلوق کو دعوت دینے کی استعداد پیدا ہوگئی میں آپ اک ہی لحہ میں غائب ہیں اور حاضر بھی ہیں یا معنی ہوگا کیا ہم نے آپ کے سینے کو وسیع نہیں کیا ان حکمتوں کے اور ہم نے اس سے جہالت کی تاریکی کو زائل فرمایا اور کہا گیا ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو کہ سابقہ تمام تاویلات کی طرف اشارہ ہے اور اسے دھویا پھر ایمان اور علم سے اسے بھر دیا

﴿وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ﴾

(اور ہم نے اتار دیا ہے آپ سے آپ کا بوجھ) یعنی آپ کے اوپر سے بھاری بوجھ کو اتار دیا۔

﴿الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ﴾

(جس نے بوجھل کر دیا تھا آپ کی پیٹھ کو) ایسا بوجھ جس نے آپ کو نقیض پر مجبور کر دیا اور نقض کجاوے کی آواز ہے جو بھاری بوجھ کیوجہ سے پیدا کرتی ہے اور نبی کریم ﷺ پر بوجھ تو وہ نبوت سے قبل آپ سے صادر ہونے والے (فرطات) ایسے امور جن کو انسان اپنی شان سے کم جائے یا حکمتوں اور احکام کی وجہ سے آپ پر جو بوجھ تھا وہ مراد ہے یا آپ پر جو حسرت طاری ہوئی یا وحی کو قبول کرنے کی مشقت مراد ہے۔

﴿الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ﴾

(جس نے بوجھل کر دیا تھا آپ کی پیٹھ کو) نبوت اور اس کے علاوہ دوسرے انعامات عطا کیے اور ان سے بڑھ کر بلند کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے نام کو اپنے رب کے نام کے ساتھ ملایا شہادتیں میں اور آپ کی اطاعت کو اپنی قرار دیا ہے اپنے ملائکہ کے درمیان آپ پر درود بھیجا (یعنی آپ پر رحمتوں کا نزول فرمایا) اور مؤمنین کو بھی آپ پر درود پڑھنے کا حکم دیا۔

﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ﴾

(پس یقیناً ہر مشکل کے ساتھ)

جیسے سینے کی تنگی اور ایسا بوجھ کو پشت توڑے جا رہا ہو اور قوم کا گمراہ ہونا انکا تکلیفیں دینا۔

﴿یُسْرًا﴾

(آسانی ہے) جیسے اتار دینا اور قوم کو ہدایت اور اطاعت کی توفیق دینا یسر کو نکرہ ذکر کرنا تعظیم کے لئے اور ''ان مع'' میں جو مصاحبت کا معنی ہے یہ یسر کا عسر کے پیچھے آنے میں مبالغہ ہے اور عسر یسر سے یوں متصل ہو گی جس طرح دو چیزیں ملی ہوئی ہیں۔

﴿اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا﴾

(بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے) اس کو مکرر لانا تاکید کے لئے ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس بات کا وعدہ کہ تنگی دوسری آسانی کے ساتھ بھی ملی ہوئی ہے جیسا کہ آخرت کا ثواب جس طرح آپ ﷺ کا فرمان روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک افطار کے وقت کی خوشی اور دوسری رب سے ملاقات کے وقت کی خوشی اور اس پر نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے کہ ''ایک تنگی'' دو خوشیوں پر غالب نہیں ہے کیونکہ العسر معرف باللام ہے اور یہ متعدد نہ ہو گا خواہ اس کا الف لام عہد خارجی کا ہو اور یسر نکرہ ہے اور یہ اس بات کا احتمال رکھتا ہے میر کے علاوہ کوئی فرد مراد لیا جائے (اصول فقہ کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر معرفہ کو مکرر ذکر کیا جائے تو اس صورت میں دونوں سے مراد ایک ہی شئی ہوتی ہے اور اگر نکرہ مکرر آجائے تو دوسرے سے پہلے کی مغایر شے مراد ہوتی ہے ۔

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ﴾

(پس جب آپ (فرائض نبوت) سے فارغ ہو) تبلیغ سے

﴿فَانْصَبْ﴾

(تو (حسب معمول) ریاضت میں لگ جائے)

ہم نے آپ پر جو سابقہ نعمتیں کی ہیں یا آنے والی جن نعمتوں کا وعدہ کیا ہے ان کا شکر بجالاتے ہوئے عبادت میں مشغول ہو جائیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب آپ غزوات (جہاد) سے فارغ ہوئے تو عبادت میں مشغول ہو جائے یا جب آپ سے فارغ ہو جائیں تو دعا میں مشغول ہو جائیں۔

﴿وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾

(اور اپنے رب کی طرف راغب ہو جائے)

سوال کرنے کے ساتھ اور اس کے علاوہ کسی سے سوال نہ کیا جائے اس لئے اسے فرغِبْ بھی پڑھا جاتا ہے یعنی لوگوں کو اس کا ثواب طلب کرنے کی طرف ترغیب دیجئے۔

سورۃ نمبر 18	سورہ التین	بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	کل آیات 8

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ﴾

(قسم ہے انجیر وزیتون کی) اللہ تعالیٰ نے پھلوں میں سے انجیر وزیتون کو قسم کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ انجیر ایسا عمدہ پھل ہے جس میں کوئی اضافی چیز نہیں ہوتی (یعنی گٹھلی بھی نہیں ہوتی) اور انجیر بہت زیادہ لطیف غزا ہے جلدی ہضم ہونے والی اور کثیر منافع والی ہے کیونکہ یہ طبیعت کو نرم اور بلغم کو تحلیل کرتی ہے اور گردوں کو پاک کرتی ہے اور مثانہ کی پتھری کو زائل کرتی ہے اور جگر وتلی کے سوراخوں کو کھول دیتی ہے اور یہ بدن کو قوی کرتی ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ یہ بواسیر کو ختم کرتی ہے اور جوڑوں کے درد میں نفع دیتی ہے

اور زیتون پھل، سالن اور دوا بھی ہے اس کا تیل بہت لطیف ہوتا ہے جس کے بہت زیادہ فائدے ہیں باوجود اس کہ کہ یہ جس جگہ اُگتا ہے وہاں چکناہٹ بالکل نہیں ہوتی جسا کہ پہاڑوں میں

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان دونوں سے مراد وہ پہاڑ میں جو مقدس زمین (بیت المقدس) میں ہیں یا دمشق اور بیت المقدس کی دو مسجدیں مراد ہیں یا دو شہر مراد ہیں

﴿وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ﴾

(اور قسم ہے طورِ سینا کی) یعنی ااس پہاڑ کی جہاں حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے رب سے مناجات کیں، سنین اور سیناء اس پہاڑ کے اندر دو مقام (جگہوں) کے نام ہیں

﴿وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ﴾

(اور اس امن والے شہر (مکہ مکرمہ) کی) یعنی امن دینے والے شہر کی اور یہ "امن الرجل امانته فهو امين" سے ماخوذ ہے (آدمی نے امانت کی حفاظت کی پس وہ امین ہے)

یا پھر مامون کے معنی میں ہے جو اس میں داخل ہوا وہ امن میں ہو گیا اور اس (شہر) سے مراد مکہ معظمہ ہے

(الا من کے بارے میں دو احتمال ہیں۔)

"الآ من" کے لفظ سے اس جانب اشارہ فرما رہے ہیں کہ "الآ من" فعیل بمعنی فاعل ہے۔

"المامون" کے لفظ سے اس جانب اشارہ ہے کہ "الا من" فعیل بمعنی مفعول ہے۔

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ﴾

(بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے) الانسان کے ساتھ جنس مراد ہے

(یعنی بتا رہے ہیں کہ الانسان پر جو الف لام ہے وہ الف لام جنسی کا ہے اور تمام انسان مراد ہیں)

﴿فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾

((عقل وشکل کے اعتبار سے) بہترین اعتدال پر) یعنی بہترین توازن پر پیدا فرمایا اس طرح کہ (سیدھے) قد و قامت، خوب صورت اور کائنات کے خواص کی جامعیت اور تمام ممکنہ نظائر کی اکملیت کے ساتھ خاص کیا

﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ﴾

(پھر ہم نے لوٹا دیا اس کو پست ترین حالت کی طرف) اھل نار میں سے بنانے کے ساتھ یا پست ترین مکان کی طرف پھیر دیا اور وہ آگ ہے (یعنی جہنم کا آخری طبقہ ہے) پس اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے) (استثناء منقطع) ہے

بان جعلنا ہ من اھل النار کی عبارت سے اس جانب اشارہ فرمارہے ہیں کہ اسفل سافلین ودنا کی "ہ"، ضمیر سے حال واقع ہورہا ہے۔

(الی اسفل سافلین کی عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ یعنی مجرور سے پہلے حرف جار محذوف ہے اگر اسفل سافلین کو حال بنائے تو اس وقت الا الذین یہ استثناء متصل ہوگا۔

سوال: لیکن اگر ہم اسفل سافلین سے مراد ارذل ا لعمر لیں تو اعتراض یہ ہوتا ہے کہ مومن بھی بوڑھا ہوتا ہے اور کافر بھی تو ان دونوں میں فرق کیا ہوا؟

جواب: یہ ہے کہ بے شک مومن و کافر دونوں بوڑھے ہوتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مومن جنت کی طرف بڑھتا ہے اور کافر جہنم کی طرف بڑھتا ہے اللہ تعالیٰ مومنین کے لئے فرمارہا ہے کہ بے شک ان پر بھی بڑھاپہ آئے گا لیکن اس کے باوجود ان کے لئے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اسفل سافلین سے ارذل العمر مراد لینے کی صورت میں الا الذین یہ استثناء منقطع ہوگا اور الا بمعنی لکن ہوگا

ترکیب بھی ملاحظہ فرمائیں

استثناء متصل کی صورت میں "ہ"، ضمیر ذوالجلال اور اسفل سافلین حال حال ذوالحال ملکر مستثنی منہ اور مستثنی ملکر ودنا فعل کا مفعول یہ جملیہ فعلیہ استثنائیہ منقطع کی صورت میں الا بمعنی لکن

"الذین امنوا وعملو الصلحت " مبتدا اور "فلھم اجر غیر ممنون" خبر مبتدا خبر ملکر جملہ اسمیہ۔

سوال: استثناء منقطع کی صورت میں خبر پر "ف" موجود ہے جبکہ خبر پر تو "ف" داخل نہیں ہوئی یہ تو جزاء پر داخل ہوتی ہے؟

جواب: جب مبتدا میں شرط کا معنی پایا جائے تو خبر پر ف داخل ہوجاتی ہے۔

﴿فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾

(تو ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے) ایسا اجر جو منقطع نہیں ہوگا یا ان پر اس کے بدلہ احسان نہیں جتلایا جائے گا

﴿فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ﴾

(پس کون جھٹلاسکتا ہے آپ کو اس کے بعد) یعنی اے محمد ﷺ! کونسی چیز از روئے دلالت اور کلام کے آپ کو جھٹلاسکتی ہے

﴿بِالدِّيْنِ﴾

(جزاوسزا کے معاملہ میں) الدین کا معنی جزاء ہے معنی یہ ہوگا ان کے دلائل ظاہر ہوجانے کے بعد جزاء کے معاملہ میں آپ کو کونسی چیز جھٹلاسکتی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے ما بمعنی مَن ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خطاب (نبی ﷺ کو نہیں بلکہ) التفات کے طریقہ پر انسان کو ہے اومعنیہ ہوگا (اے انسان!) کونسی چیز نے تمہیں اس جھوٹ پر برانگیختہ کیا ہے

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ﴾

(کیا نہیں ہے اللہ تعالی سب حاکموں سے بڑا حاکم) یہ ان اشیاء کو ثابت کررہا ہے کہ جو گزر چکی ہیں۔اور معنی یہ ہوگا کہ کیا وہ ذات جس نے انسان کو پیدا کیا اور لوٹایا کیا وہ صناعت وتدبیر کے اعتبار سے اَحْکَمِ الْحٰکِمِیْن نہیں ہے یا جو ذات ان صفات کی طرح انسان کو دوبارہ پیدا کرنے اور جزاء دینے پر قادر ہے، جس طرح کہ پہلے بھی کئی مرتبہ گزر چکا ہے (کیا اَحْکَمِ الْحٰکِمِیْن نہیں ہے)

سورۃ نمبر19	سورہ العلق	بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	کل آیات 19

﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ﴾

(آپ پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ) قرآن کریم کو اپنے رب کے نام سے ابتدا کرتے ہوئے پڑھیے یا اپنے رب سے مدد طلب کرتے ہوئے پڑھیے۔

(مستعیناً کی عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ '' باسم ربك '' حال ہے۔

مستعینا کی عبارت سے اس جانب بھی اشارہ ہے کہ ''ب'' ملابست کے لئے ہے۔

مستعینا کی عبارت سے اس جانب بھی اشارہ ہے کہ ''ب'' استعانت کے لئے ہے۔

﴿الَّذِیۡ خَلَقَ﴾

(جس نے (سب کو) پیدا کیا) جس کی شان پیدا کرنا ہے یا جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کا انفرادی طور پر ذکر فرمایا جو بہت شرف والا اور صنعت و تدبیر کے اعتبار سے سب سے زیادہ ظاہر اور قرأت سے مقصود عبادت پر زیادہ دلالت کرنے والا ہے پس فرمایا ﴿خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ﴾ (پیدا کیا انسان کو) یا جس نے انسان کو پیدا فرمایا اور پہلے کلام کو مبہم بیان کیا پھر انسانی تخلیق کی شان بڑھانے کے لیے اور اس کی فطرت کے عجیب ہونے پر دلالات کے لیے اس کی تفسیر بیان فرمائی

الذی له الخلق سے اس جانب اشارہ ہے کہ خلق فعل لازم ہے اور الذی خلق کل شیء سے اس جانب اشارہ ہے کہ خلق فعل متعدی ہے

سوال: کون سی چیز مذکورہ اشیاء پر زیادہ دلالت کرنے والی ہیں؟

جواب: انسان کی ذات ہے جو صفت و تدبیر اور دیگر کمالات خداوند پر زیادہ دلالت کرنے والی ہے

﴿مِنۡ عَلَقٍ﴾

(جمے ہوئے خون سے) یہ علقۃ کی جمع ہے کیونکہ انسان (بذات خود) جمع کے معنی میں ہے اور جب اولیں فریضہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے تو سب سے پہلے اس شے کا ذکر فرمایا جو اس کے وجود قدرت کی زیادتی اور کمال حکمت پر دلالت کرتی ہے

﴿اِقۡرَاۡ﴾

(پڑھیے) یہ مبالغہ کے لیے پہلے اقرأ سے تکرار ہے یا پہلا اقرأ مطلق ہے اور دوسرا تبلیغ کے لیے ہے (یا پہلا مطلق پڑھنے کا حکم ہے اور دوسرا) نماز میں پڑھنے کا حکم ہے اور شاید جب نبی کریم علیہ السلام کو کہا گیا اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا ''ما انا بقاری '' (یہ قول ضعیف ہے، ضعیف ہے) پس دوبارہ عرض کیا گیا کہ اِقۡرَاۡ پڑھیے (ما انا بقاری قول ضعیف ہے، ما انا بقاری قول ضعیف ہے)

﴿وَرَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ﴾

(آپ کا رب بڑا کریم ہے) (اس کی ذات) صفت کریم میں ہر کریم سے بڑھ کر ہے (کیونکہ) وہ بغیر ضرض کے انعام فرماتا ہے اور بغیر کسی خوف کے حلم و بردباری کا مظاہرہ فرماتا ہے بلکہ درحقیقت وہی کریم ہے

دنیا میں کوئی بھی کریم شخص کسی پر احسان کرتا ہے تو وہ کسی نہ کسی لالچ (غرض) کی وجہ سے کرتا ہے حتی کہ اگر کوئی پارساء پرہیزگار بھی احسان کرتا ہے کہ تو کم از کم اس کے دل میں یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ اللہ قیامت کے دن اس کا بدلہ عطا فرمائے گا لیکن اللہ تعالیٰ ایسا کریم ہے کہ جو بغیر کسی غرض (عوض) کے احسان فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے جب بھی اسم تفضیل کا صیغہ استعمال ہو تو وہ ہمیشہ صفت مشبہ افعل بمعنی فعیل کے معنی میں ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مدمقابل نہیں اور وہ وحدہ لاشریک ہے۔

﴿الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ﴾

(جس نے علم سکھایا قلم کے واسطہ سے) یعنی قلم کے ذریعے علم سکھایا اور عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کو الخط بالقلم بھی پڑھا گیا ہے تا کہ اس کے ساتھ علوم کو مقید کیا جا سکے اور دور والوں کو علم سکھایا جا سکے

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾

(اسی نے سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا) قوتوں کو پیدا کرنے کے ساتھ اور (علم کے بارے) دلائل معین کرنے کے ساتھ اور آیات نازل فرمانے کے ساتھ (جو کچھ انسان نہیں جانتا تھا وہ سب کچھ سکھا دیا۔

حلق القوی سے مراد حواس خمسہ قوت لامہ، قوت باصرہ، قوت شامعہ، قوت سامعہ۔

نصب الدلائل سے مراد سورج، چاند، ستارے، اور دیگر چیزیں ہیں۔

انزال الآیات سے مراد قرآنی آیات ہیں۔

پس آپ ﷺ کو قرأت کرنا سکھا دیا اگر چہ آپ ﷺ پڑھنے والے نہیں تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس جگہ انسان کی ابتداء اور انتہاء کے معاملہ کو شمار کیا ان نعمتوں کا اظہار فرماتے ہوئے جو انسان پر کی ان میں سے یہ ہے کہ انسان کو خسیس اور رذیل ترین مرتبہ سے بلند ترین مرتبہ کی طرف بلند فرمایا اپنی ربوبیت کو ثابت کرنے اور سب سے زیادہ کریم ہونے کو متحقق کرنے کے لیا اور پہلے اس چیز کی طرف اشارہ فرمایا جو اس کی معرفت پر عقل کے اعتبار سے سدلالت کرنے والی ہے پھر اس چیز پر متنبہ کیا جو از روئے سماع اس کی معرفت پر دلالت کرنے والی ہے

﴿كَلَّا﴾

(ہاں ہاں !) یہ اس آدمی کو جھڑ کنا ہے جس نے اپنی سرکشی کی وجہ سے اللہ کی نعمتوں کا انکار کیا اور یہ جھڑ کنا کلام کے اس پر دلالت کرنے کے اعتبار سے ہے اگر چہ اس کا ذکر پہلے موجود نہیں ہے

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ کلا سے پہلے اگر ایسا کلام موجود ہو جس سے جھڑ کنا مقصود ہو یا کسی کام سے روکنا مقصود ہو تو کلا ردع وزجر کے معنی میں ہوتا ہے اور اگر کلا سے پہلے ایسا کلام موجود نہ ہو تو یہ حقا، نعم وغیرہ کے معنی میں ہوتا ہے۔

اعتراض: کلا سے پہلے تو ایسا کوئی کلام موجود نہیں جو اس بات پر دلالت کرے کہ کلا ردع کے معنی میں ہے پھر یہاں اس کو ردع وزجر کے معنی میں کیوں استعمال کیا گیا ہے؟

جواب: بے شک ایسا کوئی کلام موجود نہیں ہے لیکن کلام کا سیاق وسباق اس چیز پر دلالت کر رہا ہے کہ کلا ردع وزجر کے معنی میں ہے۔

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى﴾

(بے شک انسان سرکشی کرنے لگتا ہے اس بناء پر کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے) یعنی انسان نے اپنے آپ کو غنی خیال کیا اور اسْتَغْنٰى (راہ فعل کا) مفعول ثانی ہے کیونکہ ''راہ'' علم کے معنی میں ہے اور اسی وجہ سے جائز ہے کہ اس کے فاعل ومفعول دونوں ایک ہی ذات کی طرف راجع ہوں افعال قلوب کے علاوہ کسی بھی فعل کا فاعل اور مفعول ایک ہی قسم کی دو ضمیریں نہیں ہو سکتی مثلاً یہ جملہ کہنا درست نہیں۔

اضربنی : بلکہ کہا جائے گا اضرب نفسی

ضربتك : ضربت نفسك

جبکہ افعال قلوب کی یہ خصوصیت ہے کہ ایک ہی قسم کی ضمیریں فاعل اور مفعول بن سکتی ہیں جیسے راہ و جدتك غنیاً ۔

﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى﴾

((اے غافل) یقیناً تجھے اپنے رب کی طرف ہی پلٹنا ہے۔) التفا کے طریقے پر انسان کو خطاب کرنا ہے دھمکی دینا اور سرکشی کے انجام سے ڈرانا ہے اور الرجعی مصدر ہے جیسے بشری ہے (بشری فعلی کے وزن پر مصدر ہے)

﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی﴾

((اے حبیب!) آپ نے دیکھا اسے جو منع کرتا ہے ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے) یہ آیت ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی، ابوجہل نے کہا تھا کہ اگر میں نے حضرت محمد ﷺ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تو میں ان کی گردن مبارک کو (العیا ذباللہ) روندڈالونگا۔

یہاں عبارت محذوف ہے (رأی ساجدا) پس بدبخت نے حضور ﷺ کو حالت میں پایا تو وہ آپ ﷺ کی طرف آگے بڑھا پھر الٹے پاؤں پلٹ گیا اس سے کہا گیا ہے کہ تمہیں کیا ہوا؟ تو اس (بدبخت) نے جواب دیا کہ میں نے حضور ﷺ اور اپنے درمیان آگ کی خندق دیکھی اور خوفناکی اور پر دیکھے پس یہ آیت نازل ہوئی۔

سوال: اللہ رب العزت نے اپنے حبیب آقا دو عالم کو بے شمار صفات سے نوازہ ہے لیکن یہاں حضور ﷺ کی صفت عبد کو ہی کیوں ذکر فرمایا اس میں کیا حکمت عملی پوشیدہ ہے؟

جواب: لفظ عبد کو ذکر کرنا اور اسے نکرہ ذکر کرنا نہی کی قباحت میں مبالغہ آرائی کے لئے ہے اور حضور ﷺ جنہیں روکا جارہا ہے کی کمال عبدیت پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔

﴿اَرَءَیْتَ اِنْ کَانَ عَلَی الْھُدٰۤی اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی﴾ اَرَءَیْتَ پہلے کا تکرار ہے اور اسی طرح اللہ تعالی کے ارشاد میں بھی تکرار ہے

(بھلا دیکھیے تو اگر وہ ہدایت پر ہوتا یا پرہیزگاری کا حکم دیتا (تو اس کے لیے کتنا بہتر ہوتا))

﴿اَرَءَیْتَ اِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی، اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی﴾

(روگردانی کی، کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ (اسے) دیکھ رہا ہے)

ترجمہ سے قبل تھوڑی وضاحت ملاحظہ فرمائیں

"اریت ان کان علی الھدی او امر با لتقوی "

"اریت ان کذب وتولی الم یعلم بان اللہ یری"

پہلا اریت فعل بافاعل ہے اور " ان کان علی الھدی او امر با لتقوی " جملہ شرطیہ ہو کر اریت کا مفعول بہ ثانی ہے اور مفعول بہ اول ''ہ'' ضمیر "ان کان علی الھدی او امر با لتقوی" شرط ہے جس کا جواب شرط محذوف ہے۔

اسی طرح دوسرا اریت فعل بفاعل اور "ان کذب وتولی الم یعلم با ن اللہ یری " جملہ شرطیہ ہو کر مفعول بہ ہے اور مفعول بہ اول ''ہ'' ضمیر محذوف ہے "ان کذب وتولی "شرط اور "الم یعلم بان اللہ یری "جزا ہے۔

یہاں پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ " الم یعلم بان اللہ یری " جملہ انشائیہ ہے اور آپ ﷺ بخوبی جانتے ہیں کہ جب جملہ انشائیہ جزاء واقع ہو تو اس پر ''ف'' کا آنا لازم (واجب) ہوتا ہے تو یہاں پر الم یعلم بان اللہ یری پر ''ف'' کیوں نہیں آئی؟

جواب: علماء نحو اس مسئلہ کو حل کرنے سے قاصر ہیں آج تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا البتہ بعض علماء نحو نے اس کی محذوفت توجیہات بیان کی ہیں ان میں سے ایک آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

الم یعلم بان اللہ یری میں جو استفہام ہے یہ اپنے اصل معنی میں نہیں ہے اور جب استفہام اصل معنی میں نہیں ہوگا تو پھر یہ جملہ انشائیہ نہیں ہوگا بلکہ جملہ خبریہ ہوگا اور جملہ خبریہ جب جزاء واقع ہو تو اس پر ف کا داخل ضروری نہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم والصواب

یہ جملہ شرطیہ ہے اور ارأیت کا مفعول ثانی ہے اور جواب شرط محذوف ہے جس پر شرط ثانی ان کذب وتولی کا جواب الم یعلم با ن اللہ یری دلالت کر رہا ہے جو کہ دوسری شرط ان کذب کے لیے قسم کے طور پر استعمال ہو رہا ہے

ترجمہ سے پہلے وضاحت ملاحظہ فرمائیں

"ان کان علی الھدی او امر با التقوی ان کذب وتولی "

پہلی صورت: کان امر، کذب اور تولی میں ھوضمیر ابو جہل کافر کی طرف لوٹ رہی ہے۔

دوسری صورت: کان، امر میں ھوضمیر آقا دو عالم ﷺ کی طرف راجح ہیں اور تولی میں ھوضمیر ابو جہل کی طرف لوٹ رہی ہے۔

ترجمہ ملاحظہ فرمائیں

پہلی صورت میں یعنی جب چاروں ضمیریں ابو جہل کی طرف راجح ہوگی تو ترجمہ ہوگا۔

مجھے خبر دیجئے اس شخص کے بارے میں جو اللہ کے کسی بندے کو اس کی نماز سے روکتا ہے اگر یہ روکنے والا ہدایت پر ہے ان امور میں جن سے وہ روک رہا ہے تقوی کا حکم دینے والا ہے ان امور میں جن کے ساتھ وہ بتوں کی پوجا کرنے کا حکم دیتا ہے جیسے وہ عقیدہ رکھتا ہے۔

یعنی وہ ہدایت پر تو نہیں لیکن کیا وہ شخص اپنے غلط عقیدہ کے مطابق بھی ہدایت پر ہے؟

دوسری صورت یعنی جب کان علی الھدی او امر بالتقوی کی دونوں ضمیریں آقا دو عالم ﷺ کی طرف راجح ہوگی۔

معنی ہوگا۔

اگر وہ حق کو جھٹلانے اور سیدھے راستے سے روگردانی کے طریقے (راستے) پر ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے کہ اور اس کے گمراہ کن اور ہدایت یافتہ احوال پر مطلع ہے؟

اور کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہوگا کہ آپ خبر تو دیجیے اس شخص کے بارے میں جو اس شخص کو روکتا ہے جو نماز ادا کرتا ہے اور جسے روکا گیا ہے وہ تو ہدایت پر ہیں اور پرہیز گاری کا حکم دینے والا ہے اور روکنے والا جھوٹ بولنے والا ہے اور حق سے روگردانی کرنے والا ہے۔

یہ صورت پہلی صورت سے بھی کتنی تعجب خیز ہے

اور کہا گیا ہے کہ دوسرے (ان کان علی الھدی او امر بالتقوی) میں کافر کو خطاب ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حاکم کی طرح ہے جس کے سامنے دو جھگڑا کرنے والے حاضر ہیں اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ پہلے کو مخاطب فرماتا ہے اور دوسری مرتبہ دوسرے کو خطاب فرماتا ہے گویا کہ اگر اس کی نماز ہدایت اور اس کی اے کافر! مجھے بتا اگر اس کی نماز ہدایت اور اس کی عبادت الی اللہ پرہیز گار کا حکم ہے کیا (اس کے باوجود) تو اسے روکتا ہے؟

سوال: اللہ تعالیٰ نے (اریت الذی ینھی عبدا او صلی) میں صرف نماز سے روکنے کا ذکر فرمایا ہے جب کہ بعد میں "اریت ان کان علی الھدی او امر با التقوی "میں پرہیز گاری سے روکنے کا بھی ذکر فرمایا ہے اس طرح تو ان دو آیتوں کے درمیان تعارض واقع ہو رہا ہے؟

جواب: گویا کہ (شاید کہ اللہ تعالیٰ نے تعجب اور زجر و توبیخ (برانگیختہ کرنے کی صورت میں امر بالتقوی کا ذکر فرمایا حالانکہ نہی میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ روکنا نماز اور پرہیز گاری کے حکم سے ہے۔ پس نماز کے ذکر پر اقتصار کیا گیا ہے کیونکہ یہ دعوت بالفعل ہے یا (نہی میں کوئی تعارض نہیں ہے) کیونکہ بندہ جب نماز ادا کر رہا ہو تو اسے روکنا دو باتوں کا احتمال رکھتا ہے کہ اسے نماز سے روکا جا رہا ہے یا نماز کے علاوہ دوسرے امور سے روکا جا رہا ہے:

(یعنی نماز ادا کرنا دعوت بالفعل ہے اور پرہیز گاری کا حکم دینا دعوت بالقول ہے اور دعوت بالفعل دعوت بالقول سے افضل ہے تو پس یہاں افضل چیز کا ذکر فرمادیا)

عبادت کے ساتھ نفس کی تکمیل میں عام احوال کو شمار کیا گیا ہے اور نماز کے علاوہ باقی احوال کو دعوت کے ساتھ نفس کی تکمیل میں شمار کیا گیا ہے۔

﴿کَلَّا﴾

(خبردار) یہ روکنے والے کو جھڑکنا ہے

﴿لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ﴾ (اگر وہ (اپنی روش سے) باز نہ آیا) ان امور سے جن میں وہ موجود ہے (جن پر وہ قائم ہے)

﴿لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ﴾

(تو ہم ضرور (اسے) گھسیٹیں گئے اس کے پیشانی کے بالوں سے) ہم اسے پیشانی کے بالوں سے ضرور پکڑیں گے اور ہم اسے گھسیٹ کر جہنم کی طرف لے جائیں گے

النسفع سے مراد کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنا اور شدت کے ساتھ اسے گھسیٹنا ہے اور اسے لنسفعَنّ نون مشدد کے ساتھ اور لاسفعن بھی پڑھا گیا ہے اور مصحف میں الف کے ساتھ وقف کے حکم پر لکھا ہوا ہے اور الناصیہ کی بجائے اضافت سے معرف باللام ہونے پر اکتفاء کیا گیا ہے اس بات کا علم ہونے کی وجہ سے کہ اس سے مراد مذکورہ ناصیہ ہی ہے

﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ﴾

(وہ پیشانی جو جھوٹی (اور) خطاء کار ہے) یہ الناصیۃ سے بدل ہے اور بدل میں اس کی صفت موجود ہونے کی وجہ سے جائز ہے

اسے رفع کے ساتھ "هي ناصبةٌ" کی بنا پر بھی پڑھا گیا ہے۔

رفع کی صورت	هي ناصبةٌ	مبتدا خبر
نصب کی صورت	أذم ناصيةً	فعل، فاعل ومفعول

اور کذب و خطأ کے ساتھ صفت لگانا جبکہ یہ دونوں اس کے صاحب کے لئے ہیں۔ اسناد مجازی کے طور پر مبالغہ کے لئے ہے۔

یعنی جز بول کر کل مراد ہے (مجاز مرسل ہے)

﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ﴾

(پس وہ بلالے اپنے ہم نشینوں کو (اپنی مدد کے لیے)) یعنی اہل مجلس کو تا کہ وہ اس کی مدد کریں اور نادیۃ سے مراد وہ مجلس ہے جس میں قوم جمع ہو کرتی تھی (یہاں مجاز مرسل ہے حال بول کر محل مراد ہے) روایت کیا گیا ہے کہ ابوجہل رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرا اس حال میں کہ آپ ﷺ نماز ادا فرما رہے تھے تو ابوجہل نے کہا کیا میں نے آپ ﷺ کو روکا نہیں تھا تو پس رسول اللہ ﷺ نے ابوجہل سے سختی فرمائی تو ابوجہل نے کہا! کیا آپ ﷺ مجھے دھمکی دیتے ہیں جبکہ میں از روئے مجلس کہ کثیر وادی والا ہوں (یعنی میرے جماعت کرنے والے بہت کثیر ہیں ایک آواز پر سب لوگ اکھٹے ہو جاتے ہیں)

(اعراب ملاحظہ فرمائیں "فا غلظ له رسولُ الله ﷺ")

پس یہ آیت نازل ہوئی ﴿سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ﴾ (ہم بھی جہنم کے فرشتے بلائیں گے) تا کہ وہ اسے جہنم کی طرف کھینچ کر لے جائیں اور یہ اصل میں شرط ہے اس کا واحد "زِبْنِيَّة" ہے جیسا کہ عفریۃ ہے اور یہ "الذبن" سے ماخوذ ہیا وراس کا معنی دھکیلنا ہے یا یہ نسبت کے طور پر زبنی سے مشتق ہے اور اس کی اصل زبانی ہے "ت" کو "ی" کے عوض لیا گیا ہے (مُعَوَّضَة) (یعنی زبانی میں ایک "ی" کو حذف کر کے "ت" کو اس کی جگہ رکھ دیا)

﴿كَلَّا﴾

(ہاں ہاں!) یہ بھی روکنے والے کو جھڑکنا ہے

﴿لَا تُطِعْهُ﴾

(اس کی ایک نہ سنیں) اپنی اطاعت پر ثابت قدم رہیے

﴿وَاسْجُدْ﴾ (اے حبیب!) سجدہ کیجیے) اپنے سجدوں پر دوام اختیار کیجئے

﴿وَاقْتَرِبْ﴾ (اور (ہم سے اور) قریب ہو جائیے) اور اپنے رب کے قریب ہو جائیے اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ بندہ اپنے رب کے قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدہ کرتا ہے

سورۃ نمبر 20	سورہ القدر	بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	کل آیات 5

﴿اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ﴾

(بے شک ہم نے اس (قرآن) کو اتارا ہے شبِ قدر میں) اس میں ''ہ'' ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔

اللہ تعالیٰ نے (مرجع) ذکر کیے بغیر اس کو مخفی کرنے کے ساتھ قرآن کی شان بیان فرمائی ہے اس کے لئے شیرت کی شہادت دیتے ہوئے جو اسے وضاحت (صراحت) سے مستحق کردے جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے نازل کرنے کی سند کو اپنی طرف منسوب کرنے کے ساتھ اس کی عظمت بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے جس وقت میں قرآن کو نازل فرمایا اس کی عظمت اپنے اس فرمان کے ساتھ فرمائی۔

﴿وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ ـ لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ﴾

(اور آپ کچھ جانتے ہیں کہ شبِ قدر کیا ہے شبِ قدر بہتر ہے ہزار مہینوں سے)

اور قرآن کو نازل کرنا جیسے کہ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کی ابتداء دن کے وقت غار حرا میں سورۃ العلق کی ابتدائی آیات سے ہوئی نہ کہ رات کے وقت اس لئے کہ امام بیضاوی کا یہ قول راجح نہیں ہے بلکہ دوسرا قول راجح ہے۔

دوسرا قول:

اللہ تعالیٰ نے مکمل قرآن کریم کو لوح محفوظ سے آسمان دنیا کی طرف فرشتوں پر نازل فرمایا۔

پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام 23 سالوں میں تھوڑا تھوڑا لیکر حضور ﷺ پر نازل ہوا اور کہا گیا ہے کہ ہم نے قرآن کو فضیلت کی راتوں میں نازل فرمایا اور یہ فضیلت کی رات رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہے اور شاید کہ یہ 27 کی رات ہے

سوال: اللہ تعالیٰ نے اتنی فضیلت بھری رات کو اپنے بندوں پر مخفی کیوں فرمایا؟

جواب: کیوں کہ اس کے اخفاء کی طرف بلانا (یعنی اس کو مخفی کرنا) اس بناء پر ہے کہ جو شخص اس رات کو پانے کا ارادہ کرتا ہے وہ زیادہ راتوں کو زندہ کرے گا (یعنی اگر اللہ تعالیٰ لیلۃ القدر کو متعین فرما دیتا تو ہم لوگ بالوسل کاہل اور سست ہو جاتے اور صرف اسی ایک رات کو عبادت کرتے۔ اور لیلۃ القدر کو قدر کا نام اس کے شرف کی وجہ سے دیا گیا ہے یا اس میں امور کے مقدر ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ (جمال القرآن ترجمہ دیکھیں)

سوال: اللہ تعالیٰ نے الف (ہزار کے) لفظ کو کیوں ذکر فرمایا؟

جواب: الف کو ذکر کرنا یا کثرت کی وجہ سے ہے کہ روایت کہا گیا ہے حضور ﷺ نے ایک ایسے اسرائیلی کا ذکر فرمایا جس نے اللہ کی راہ میں ایک ہزار مہینے اسلحہ زیب تن کیے رکھا پس مومنین (اس ذکر کو سن کر) متعجب ہوئے اور اپنے اعمالوں کو بنی اسرائیل کے (اعمالوں کی نسبت کم جانا پس انہیں ایسی رات عطا کر دی گئی جو اس غازی کی موت سے بہتر ہے۔

﴿تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ فِیۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ﴾

(اترتے ہیں فرشتے اور روح (القدس) اس میں، اپنے رب کے حکم سے) یہ اس چیز کو بیان کرنا ہے جس کی وجہ سے ایک ہزار مہینے پر فضیلت دی گئی ہے

﴿مِّنۡ كُلِّ اَمۡرٍ﴾

(ہر امر (خیر) کے لیے) ہر اس امر (معاملہ کے لئے ہے جس مقدر کہا گیا ہے۔ اور کل امری بھی پڑھا گیا ہے یعنی ہر انسان کے لئے (کئی وجہ سے)

﴿سَلٰمٌ هِیَ﴾

(یہ سراسر (امن و) سلامتی ہے یہ رہتی ہے) یہ سلامتی ہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس رات میں سلامتی کو ہی مقدر فرماتا ہے اور لیلۃ القدر کے علاوہ دوسری رات (شب برأت) میں سلامتی اور مصیبتوں کو مقدر فرماتا ہے۔ یا جو فرشتے مؤمنین پر سلام کرتے ہیں ان کی کثرت کے لئے سلام کرنا ہے۔

او ما هي الا سلام کی عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ سلام باب تفعیل کا اسم مصدر ہے۔

﴿حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾

(طلوع فجر تک)یعنی اس کے طلوع ہونے کا وقت مطلعۃ سے پہلے وقت مضاف مقدر نکال کر اس بات کی جانب اشارہ فرمار ہے ہیں کہ مطلعہ مصدر میمی ہے اور چونکہ میمی میں وقت کا معنیٰ نہیں پایا جاتا اس لئے وقت مصدر محذوف نکالے گے۔

اور کسائی نے اسے خلاف قیاس پڑھا ہے جیسے مرجع ہے (یعنی کسرہ کے ساتھ ہے کیونکہ مصدر مفعل کے وزن پر مطلع آتا ہے)لیکن جس طرح مرجع خلاف قیاس آیا ہے اسی طرح امام کسائی نے مطلع کو بھی خلاف قیاس پڑھا گیا ہے۔

یا غیر قیاسی طور پر اسم ظرف کا صیغہ ہے لیکن (یعنی مطلع مفعل کے وزن پر اسم ظرف کا صیغہ ہے لیکن قیاس کے مطابق باب نصر ینصر سے اسم ظرف کا صیغہ مفعل کے وزن پر آتا ہے یاد رہے کہ بارہ الفاظ ایسے ہیں جو خلاف قیاس مضارع مضموم العین (نصر ینصر) سے مفعل کے وزن پر آتے ہیں ان میں ایک مطلع بھی ہے۔